ڈاکٹر وزیر آغا

مسرت کی تلاش

مسرت کی تلاش

وزیر آغا

اظہار سنز
19۔ اردو بازار لاہور فون: 37230150
ہیڈ آفس: 9۔ ریٹی گن روڈ لاہور فون: 37220761
E-mail: izharsons_2004@hotmail.com
www.izhar-sons.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۲ء

تیسرا ایڈیشن

(اس کتاب کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۶ء میں اکادمی پنجاب لاہور نے شائع کیا تھا)

نام کتاب : مسرت کی تلاش
مصنف : وزیر آغا
مشینی خطاطی: ورڈ میکرز
سرورق : ریاظ
ناشر : سید محمد علی انجم رضوی
اظہار سنز، ۱۹ اردو بازار لاہور۔ فون: ۳۷۲۳۰۱۵۰
طابع : سید اظہار الحسن رضوی
اظہار سنز پرنٹرز لاہور۔ فون: ۳۷۲۳۰۷۹۱
قیمت : ۲۰۰ روپے

maablib.org

والدِ محترم

و ع خ

کی خدمت میں

maablib.org

maablib.org

ترتیب

ابتدائیہ

پیش لفظ / مولانا صلاح الدین احمد ۷
مقدمہ / وجیہ الدین احمد ۹

اختتامیہ

اختتامیہ / وزیر آغا ۱۱۵
پس لفظ / پروفیسر مظفر بخاری ۱۱۷

مضامین

مسرت ۲۱
مسرت...... عام زندگی میں ۳۵
مسرت اور محبت ۴۳
مسرت اور آرٹ ۵۵
مسرت اور فلسفہ ۱ ۶۷
مسرت اور فلسفہ ۲ ۸۹
فرد، سماج اور محبت ۱۰۱

maablib.org

maablib.org

پیش لفظ

اکادمی پنجاب جن مقاصد کی تحصیل و تکمیل کے لیے قائم ہوئی ہے، اُن میں ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ ملک کے "اُردو خواں" طبقے کی فکری سطح بلند کی جائے اور اس کے مطالعے کے لیے ایسی کتابیں بہم پہنچائی جائیں جن کے مطالب فکر انگیز، مگر اسلوبِ بیاں سادہ اور دل آویز ہو۔ مجھے مسرت ہے کہ اکادمی کے اس منصوبے کی ابتدا ایک ایسی کتاب سے ہو رہی ہے جو مطالب کی فکر انگیزی اور بیان کی دل آویزی، دونوں اعتبارات سے کامیاب ہے اور جسے اُردو زبان میں اپنی قسم کی ایک نہایت اچھی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔

وزیر آغا نے مسرت کی تلاش لکھ کر اہلِ قلم کے لیے ایک بہت عمدہ مثال قائم کی ہے اور صحت مند ادب کی تخلیق و اشاعت کا ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔ زندگی ایک گُلِ صد برگ ہے جس کی ہر پتی اپنے مشام میں غیر فانی نکہتوں کا مخزنِ بے پایاں رکھتی ہے۔ اب بھونروں کو یہ کون سمجھائے کہ ایک آدھ پتی ہی کا ہو رہنا اور اسی کے رس کو زندگی کا مآل تصور کر لینا کہاں کی عشق بازی ہے! فیض:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

انسانی زندگی اپنے لاتعداد مسائل اور رنگا رنگ کیفیتیں اپنے دامن میں لیے ہر وقت اُن مردانِ ہوش مند کی منتظر ہے جو انسان کو ایک بہتر، خوب تر اور جمیل تر زندگی بسر کرنے کا انداز سکھائیں اور اُسے جنتِ موعودہ کے دامِ خیال سے نکال کر اسی جنتِ ارضی کے لذائذ و انعام سے بہرہ یاب ہونے کا راز بتائیں۔ وقت ہے کہ ہمارے اہلِ قلم رسمی ادبیات کے تنگ گلی کوچوں سے نکل کر زندگی کے کشادہ و وسیع میدان میں اُتریں جہاں ہر طرف تعمیرِ افکار کا بے شمار مسالہ بکھرا پڑا ہے۔ پھر وہ چاہیں تو اسی سے فکر

کے ایسے رفیع الشان قصر تعمیر کرلیں جن کی بلندی، پروازِ تخیل اور رنگینیِ مرورِ ایام پر ہمیشہ تک خندہ زن رہے!

از بسکہ کتاب ایک روشن خیال نوجوان نے لکھی ہے، موزونیت کا تقاضا تھا کہ اِس کا مقدمہ بھی ایک ایسا نوجوان لکھے، جسے نوعمری کے باوصف، زندگی کی ماہیت اور اُس کے خوب و زشت پر کچھ غور و فکر کرنے اور اپنے نتائج فکر کو سلیقے سے جامۂ الفاظ پہنانے کا موقع عطا ہُوا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ وزیر آغا نے اِس خدمت کی انجام دہی کے لیے جس رفیق کا اِنتخاب کیا وُہ نہ صرف اُن کے معیار پر پورا اُترتا ہے بلکہ اُس نے واقعی ایک فکر انگیز اور دلآویز دیباچہ لکھ کر، خود تلاشِ مسرت کے تقاضوں کو بھی پُورا کیا ہے۔

صلاح الدین احمد

maablib.org

مقدمہ

"خود کو پہچان"…… یہ تھی سُقراط کی تعلیم۔ سقراطؔ صُوفی مَنِش آدمی تھا۔ اُس نے جب مشاہدۂ باطن، خود نگاہی اَور خود شناسی کا سبق دیا تو اُس کا رُوئے سخن سالک کی ذات کی طرف تھا۔ اُس کے مسلک میں قدیم یونانی فلسفے کی طرح فردِ واحد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ البتہ افلاطون نے جو اِس مقولے کی تفسیر پیش کی ہے، اُس سے یونانی حکمت میں ایک نئے نقطۂ نظر کا اِضافہ ہُوا ہے۔ افلاطون نے اِنفرادی خود شناسی کے بجائے اِجتماعی خود آگاہی کو تحقیق و تجسس کی آخری منزل قرار دیا ہے۔ اُس کی نظر میں اِنسانی فطرت کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی قدیم کتبے یا لَوح پر لکھی ہُوئی تحریر کو پڑھنے کی کوشش! اِنفرادی تجربہ جس نوشت کو پیش کرتا ہے، وُہ ایسے باریک اَور شکستہ حُروف میں لکھی ہُوئی ہے کہ اُسے برسوں کی چشم سوزی کے بعد بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔ اِنسان کی اِجتماعی زندگی اِنھیں حُروف کو ایک بڑے پیمانے پر پھیلا کر ہماری نظروں کے سامنے لا رکھتی ہے۔ اِس طرح ہر نقش واضح اَور روشن ہو جاتا ہے اور پُوری عبارت کا مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے۔ افلاطون کی نظر میں سیاسی اَور معاشرتی تنظیمات کا مطالعہ ہی اِنسانی فطرت کی صحیح عکاسی کر سکتا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ ریاست، شہریت کی بلند ترین تخلیق ہے اَور ریاست ہی کے پیکر میں اِنسان کے خدوخال پُورے طور سے نمایاں ہوتے ہیں۔

یونانی تمدن اَور حکمت کی تاریخ میں وُہ لمحہ بہت ہی اَہم ہے جب افلاطون نے اِنفرادی بصیرت اَور تجربے پر فلسفے کی بنیاد رکھنے کے بجائے اِنسان کے اِداروں، اُس کے معمولات اَور وسائل، اَور اُس کی سماجی زندگی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔

افلاطون کے نظریات اَور قدیم تر یونانی فلسفے کا تقابل یہ بات سُجھاتا ہے کہ دو چشمے ہمیشہ سے علم و دانش کے

چمن کی آبیاری کرتے آئے ہیں...... ایک طرف وہ جہاں دیدگی اور زمانہ شناسی ہے جس کا سبق تاریخ سے، حوادثِ روزگار سے اور کشاکش ہائے ہستی سے حاصل ہوتا ہے؛ دوسری طرف وہ نظر ہے جسے پانے کے لیے آدمی خود اپنی آگ میں جلتا ہے اور خود اپنا تماشائی بنتا ہے۔ مسرت کی تلاش میں انسان انھیں دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتے چلا آیا ہے۔

ان میں سے ایک تو وہ مشرب ہے جسے اختیار کر کے آدمی اچھا شہری بنتا ہے اور اپنی کمزوری اور تنہائی پر قابو پانے کے لیے اپنی ذات کو ایک منظم اور منضبط معاشرے سے وابستہ کر لیتا ہے۔ یہ وابستگی اس کے سماجی شعور کو پختہ تر بناتی ہے۔ خانگی اور جماعتی ذمے داریوں کا احساس، قومی رسم و رواج کا احترام، حسنِ اخلاق، نظم و نسق کا تحفظ، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، ہم نفسوں کی رفاقت، ہمسایے کا پاس، دوسروں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی عادت، یہ سب باتیں آہستہ آہستہ اس کی سیرت کا جزو ہو جاتی ہیں۔ وہ مل جل کر کام کرنے اور مشترکہ محنت کے پھل کو بانٹ کر کھانے کا گُر سیکھ جاتا ہے۔ سماجی ہمہ اوست کے نشے میں مگن، وہ شہد کی مکھی کی طرح کام کیے جاتا ہے اور اپنے خونِ گرم کو سماج کے تعمیری مقاصد کی نذر کر دینے میں اپنی شخصیت کی معراج اور تکمیل دیکھتا ہے۔ اس خود سپردگی میں عافیت کوشی کا رنگ ہی نہیں، ایک مثبت، جیتی جاگتی اور زندگی بخش مسرت کا احساس بھی ہے۔ یہ مسرت انسان میں دلجمعی، خود اعتمادی اور وقار پیدا کرتی ہے اور اُسے اپنی قدر و قیمت سے آشنا کراتی ہے۔ انسانی تعلقات کی جدت، حلاوت اور سماجی رشتوں کی معنویت اسی شعور کا نتیجہ ہے۔ اس شعور کی بدولت انسان اپنی کم مائگی کے احساس پر قابو پاتا ہے۔ رکھ رکھاؤ، خوش وقتی اور خوش سلیقگی سے زندگی بسر کرنے کا ڈھب سیکھتا ہے۔ زندگی کو سہل تر اور خوش نما تر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ تعمیری کام اور عملی معرکہ آرائیاں نیز روزانہ زندگی کا رنگِ طرب، جلسے اور ہنگامے، ہمدردی و ہمرازی، مہر و وفا، شکوہ و شکایت اور تمام تعلقات جو زندگی میں رچاؤ اور رنگینی پیدا کرتے ہیں، اسی "پابستگی رسم و رہِ عام" کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا راستہ، ایک ایسی پگ ڈنڈی ہے جس پر صرف تنہا آدمی چل سکتا ہے۔ یہ ایسے خود بیں و آزاد لوگوں کا مسلک ہے جو خضر کی قیادت کو بھی قبول نہیں کرتے۔ اکیلے پن کو بھلانے کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو اس قدر وسیع کر ڈالے کہ اس کی حدود تک نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ اپنے جامِ جہاں نما میں پوری کائنات کا عکس دیکھے، بجائے خود محشرِ خیال بن جائے اور دن رات دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے اصنامِ خیالی کی پرستش کیے جائے۔ ایسا ہی آدمی اپنے متعلق یہ کہہ سکتا ہے:

دیرم صنم ام برہمن ام زنارام

بہت کم لوگ اِس مشرب کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور جو اِس راستے پر چل اُٹھتے ہیں' وہ بسا اوقات ایسے دور دراز مقامات کی سیاحت کو روانہ ہو جاتے ہیں کہ اُن کی واپسی کی اُمید کم رہ جاتی ہے:

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

ایسے لوگ عام طور پر بے فیض ہوتے ہیں اور صرف اپنے لیے جیتے ہیں۔ مگر ان میں سے جو دو چار لوٹ آتے ہیں' وہ مسرت اور بہجت کے ایسے سرچشموں کا سراغ لگا آتے ہیں جن سے صدیوں تک تشنہ لبوں کی پیاس بجھتی رہتی ہے۔ دُنیا کے پیغمبر' صوفی' بلند مرتبہ فلسفی' فن کار اور شاعر ادیب! انھیں لوٹ آنے والے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی وساطت سے ہم اُس عالم تاب مسرت سے ہم کنار ہوتے ہیں جسے کتاب کے مصنف نے "احساسِ بحر آسا" کا نام دیا ہے۔

انسانی تاریخ و تمدن کے پس منظر میں مسرت کی تلاش مختلف مراحل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ پہلی منزل اولیں قبائل کی وہ زندگی ہے جس میں خارج و باطن' فرد و جماعت' خواب و حقیقت کا تضاد پورے طور سے ظاہر نہیں ہوا تھا۔ زندگی میں ایک بے لوث انہماک تھا...... بچوں کی سی معصومیت' جو ہر نئے تجربے سے دامن بھر لینے کے لیے بے قرار رہتی تھی۔ زندگی شعبوں اور خلیوں میں نہیں بٹی تھی۔ اور نہ کہیں اکیلے پن کی اُداسی تھی۔ انسان بیک وقت دیوی دیوتا' شجر' پھول' ندی' پہاڑ اور چاند ستاروں سے ہم کلام ہو سکتا تھا۔ اشیا کے باہمی ربط و تسلسل کا احساس اُس کی قوتِ مشاہدہ کی کمزوری کا نتیجہ نہیں تھا کیونکہ اُس زمانے کا آرٹ' انسان کی جزو بینی اور تیز نگاہی کا سب سے بڑا شاہد ہے۔ اِس احساس کا ماخذ ایک قوی تر جذبہ ہے...... زندگی کی وحدت و یکتائی کا تصور...... یہ احساس کہ ایک ہی موجِ بہار نے سینکڑوں پھول کھلائے ہیں: ایک ہی جیون جیوتی سے لاکھوں دیپ روشن ہوئے ہیں: فطرت ایک جیتے جاگتے' گاتے ناچتے قبیلے کی طرح تھی جس میں کوئی درجہ بندی' کوئی چھوٹے بڑے کا فرق نہ تھا۔ چنانچہ دوسری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو کوئی شرف اور امتیاز حاصل نہیں تھا۔ ہر برادری کسی حیوان سے منسوب ہوتی تھی اور ہم نسلی کا قوی احساس' سماجی رشتوں کی مضبوطی کا ضامن تھا۔ موت کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ مرنے والے اپنے گھروں میں دیوی دیوتا بن کر رہتے تھے' نہیں تو ہر تیوہار پر اُن کی روحیں پاتال سے لوٹ آتیں' دعوتوں میں شرکت کرتیں' ناچ اور رسموں ریتوں میں شامل ہوتیں۔ اِس زندگی میں ایک قسم

کی یکسوئی تھی...... ربط و ہم آہنگی کا احساس جو انسان کو اس کے سماج سے اور کُل کائنات سے بیک وقت منسلک رکھتا تھا۔ اسی لیے حصولِ مسرت میں شعوری کوشش کی کیفیت اور کاوش و طلب کا انداز پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے عرصے تک انسان اسی حالت میں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ زمانہ، انسان کی لکھی ہوئی تاریخ سے کہیں زیادہ طویل رہا ہوگا۔

سفر کی اگلی منزل شہری تہذیب کے وہ کلس، مینار اور گنبد ہیں جو انسانی تاریخ کی پہلی شعاعوں میں جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ ۵۰۰۰ ق م اور ۳۰۰۰ ق م کا درمیانی وقفہ ہے۔ اس زمانے میں دریائے نیل، دجلہ و فرات، سندھ اور (قدرے بعد چین میں) دریائے ہوانگ کے کنارے شہر آباد ہوئے۔ مصر کے مقبروں، ہڑپے اور موہنجوڈرو اور خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے وطن اُر میں سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں اُن سے اس تہذیب کا کچھ سراغ ملتا ہے۔ ان شہروں کی عظیم الشان منصوبہ بندی اور وسیع پیمانے کی تعمیرات سے نہ صرف اُن لوگوں کی ہنرمندی اور محنت کشی کا پتا چلتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان مندروں، مقبروں اور شہروں کی تخلیق ایک ایسا ہی سماج کر سکتا تھا جو مشین کی طرح منظم ہو اور جس کا ہر فرد ضابطے کا پابند اور حکمِ حاکم کا تابع ہو۔ عراق و عجم کے شہروں کی تجارتی گہما گہمی سے جس ذہنیت اور اسلوبِ زندگی کا پتا چلتا ہے، اُس میں امن، سلامت روی، ایمان داری، سفید پوشی، حقوق و فرائض کے احساس اور پختہ سماجی شعور کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ اسی طرح موہنجوڈرو کے مکانوں اور بازاروں کے قاعدے اور ترتیب سے ایک ایسی ہی مدوّن اور مرتب معاشرت کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ بالغ قسم کی اجتماعیت اور مادی وسائل کی حیرت انگیز ترقی کے بالمقابل اعلیٰ روحانی اقدار کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ قدیم ترین قبائل کے اعتقادات میں بھی اس زمانے کی مذہبیت سے زیادہ بالیدگی پائی جاتی ہے۔ عبادت کا مقصد محض دیوی دیوتاؤں کو رشوت دے کر خوش رکھنا تھا۔ راہب بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے، بہترین محلوں میں رہتے تھے، سیاسی طاقت بھی بہت حد تک انہیں کے ہاتھوں میں تھی۔ ضروری نہیں کہ مذہب کی آڑ میں وہ دوسروں کو بیوقوف بناتے ہوں۔ مذہب کی حیثیت محض ایک کارآمد سماجی ادارے کی تھی اور لوگ شاید اس حقیقت سے باخبر بھی تھے اور مطمئن بھی۔ علوم کی ترقی ایک خاص نقطے پر پہنچ کر رک گئی تھی جس کے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ علم و فضل ذوقِ تجسس کی سیرابی یا روحانی تقاضوں کی تسکین کا ذریعہ نہیں تھا، محض روزمرہ کی کاربراری کا وسیلہ تھا...... ریاضی فنِ تعمیر کی تابع، فلکیات آب پاشی اور زراعت کی معاون، اور ہندسہ تجارتی اغراض کی پیداوار...... البتہ فنونِ لطیفہ اور دست کاری (خاص طور پر موسیقی

اور نقاشی) کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ برتن سازی، خوش نما زیور اور منقش ظروف اُن کی گھریلو زندگی کے اجزا تھے۔ گھریلو چیزوں سے اُنھیں اِس قدر محبت تھی کہ وہ قبروں میں بھی اُنھیں ساتھ لے جاتے تھے۔ اِس تہذیب کا مطالعہ اُن خوش باش، باعمل اور سرگرم لوگوں کی اُس زندگی کو پیش کرتا ہے جو سماجی خیر کی جدت سے نمو پاتی تھی۔ یہ تھے وہ لوگ جو طور و سینا کی رفعتوں کے بجائے اپنی گلیوں کی لوبان اور صندل سے بوجھل فضاؤں میں رہنا پسند کرتے تھے اور صحرا کی خاک چھاننے کے بجائے آپس میں مل بیٹھ کر، فراغت و آسائش سے عمر بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ تھے وہ شہر جن سے آلِ ابراہیم نے ہجرت کی اور جنھیں وہ ہمیشہ انسانی رُوح کا بندی خانہ قرار دیتے رہے اور جن پر ہمیشہ لعنت بھیجتے رہے!

ارتقا کی اگلی منزل ۵۰۰ ق م کے قریب قریب کا زمانہ ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ۸۰۰ ق م سے ۲۰۰ ق م کا درمیانی وقفہ! اِس زمانے میں چین، ایران، فلسطین، ہندوستان اور یونان میں بیک وقت، لیکن آزادانہ طور سے انسان کی رُوحانی بنیادیں تشکیل پا رہی تھیں اور اُنھیں بنیادوں کے استحکام پر انسان آج بھی تکیہ کیے ہوئے ہے۔ اِس مختصر سے زمانے میں بہت سے عجیب واقعات رُونما ہوئے۔ چین میں کنفیوشس اور لاؤزے اور اِن کے بعد موزے اور چوانگ زے نے پورے چینی فلسفے کا تار و پود تیار کیا۔ ہندوستان میں یہ اُپنشدوں اور بدھ مت کا زمانہ تھا۔ یہاں بھی چین کی طرح (مادیت اور تشکک پرستی سمیت) فلسفے کے تمام رجحانات پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ایران میں زردشت نے نیکی اور بدی کی ازلی پیکار کا تصور پیش کیا۔ فلسطین میں نبی (ایلیجا، جرمیاہ، اشعیا) پیدا ہوئے۔ یونان نے ہومر کو جنم دیا اور ہرقلیطس (Heraclitus)، ارشمیدس، افلاطون اور اَلم پرست شاعروں کو پیدا کیا۔

اِس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انسان کو پہلی مرتبہ اپنی عظمت کا احساس اور شخصیت کے لامحدود امکانات کا علم ہوا۔ ہندوستان کے رشی، چین کے جہاں گرد راہب، اسرائیلی نبی اور یونانی فلسفی (اپنے باہمی امتیازات کے باوجود) دُنیا کو ایک ہی پیغام دیتے سنائی دیے:

> انسان اپنی ذات میں سمٹ کر اور نفس کی پہنائیوں میں کھو کر ہی کائنات کے رازوں کا امین بن سکتا ہے، اور نورِ باطن اور فکر و وجدان ہی وہ مشعلِ راہ ہے جس کی روشنی میں چل کر اُس مسرتِ لازوال کو پا سکتا ہے جس کی جستجو وہ ازل سے کرتا آیا ہے۔

یہ دَور نوا سنجیِ بلبل کا عہد تھا۔ آرائشِ گُل اور چمن بندی کی فرصت کسے تھی۔ مردانِ حق کی تعلیمات نے افراد کو متاثر کیا لیکن سیاست و معاشرت کی کوئی نئی تنظیم، کوئی بہتر شیرازہ بندی ظہور پذیر نہ ہو سکی۔ یہ لوگ

اپنے بعد ایسے خزانے چھوڑ گئے تھے جن کا وارث بننے کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ کچھ عرصے بعد محض نفسا نفسی تھی اور شورِ محشر...... ایک ہنگامہ جس میں سب لوگ ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے تھے۔ آزادیٔ نفس کا پیغام انتشار و بے راہ روی کا نعرہ بن چکا تھا۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں، شہر، قبیلے اور فرقے آپس میں مصروفِ پیکار تھے۔ اِس منظر سے گھبرا کر انسانیت نے ایک مرتبہ پھر جبر و استبداد کا طوق گلے میں پہن لیا اور کنجِ قفس ہی میں عافیت چاہی:

اُٹھنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!

چین میں شی اور ہن خاندانوں کی بادشاہت آئی۔ ہندوستان میں موریا سلطنت کا استحکام ہوا۔ مغرب میں رومۃ الکبریٰ نے اپنا تسلط جما لیا اور صدیوں تک پوری دُنیا پر سیاست اور ملک گیری کا غلبہ رہا۔

انسانی تاریخ قبائلِ اولیں کی معاشرت سے شروع ہو کر قدیم تہذیبوں کے عروج و زوال سے گزرتے ہوئے انسان کے اُس عہدِ رُوحانیت تک پہنچتی ہے جس کے نقش ابھی تک دلوں پر باقی ہے۔ اُس زمانے سے آگے جو واقعات پیش آئے اُن میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز اور انقلاب آفریں لمحہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں سائنس کی ایجادات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح پُرانے زمانے کا انسان پتھر کے اوزار بنا کر اور آگ کا استعمال سیکھ کر ایک طویل سفر پر روانہ ہو گیا تھا اُسی طرح صنعتی انقلاب اور مشینی تمدن کی فتوحات سے ایک نئی تگ و دو کا آغاز ہوتا ہے۔ کیا اِس سفر کا بھی وہی انجام ہوگا؟ ویسی ہی منزلیں راہ میں آئیں گی...... کیا ایک بار پھر عظیم الشان تنظیمات کا دور آئے گا...... اسی عہد کے یہ شہر بابل، نینوا اور اُر کی طرح تباہ و برباد ہوں گے اور غارت گریٔ چمن کے بعد اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد کرنے کے منصوبے باندھیں گے...... پچھلا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا...... لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ آدمی اپنے ماضی سے سبق لے اور سر سے پانی گزر جانے سے پہلے ایک نئے نظامِ حیات اور نئے شعور کی تخلیق کرے! اس نظام کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ کے دوسرے اور تیسرے دور کی خصوصیات کی یکجائی سے ترکیب پائے گا۔ اس میں رہنے والے لوگ سماج کے سرگرم و مستعد رکن بھی ہوں گے اور اُن میں خلوت نشینوں کے احساس کی شدت، خود آگاہی اور بلند نظری بھی ہوگی۔ وہ بیک وقت مادی و رُوحانی مسرت کے عطیوں سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔ اُن میں نہ تو صرف صوفیوں کی سی بے نیازی اور بے تعلقی ہوگی اور نہ ہی محض ہوس، ناؤ نوش اور حرص و ہوا کا عالم...... اُن میں ان دونوں سے مختلف ایک تیسرا اندازِ نظر ہوگا جس کا مظہر مشرقی شاعری کا سرو ہے جو آزاد صفت بھی ہے اور گرفتارِ چمن بھی یا

بھگوت گیتا کا کنول جو جھیل میں رہتا ہے لیکن پانی سے تر نہیں ہوتا۔ اس مشینی عہد کو ایک ایسے ہمہ گیر فلسفے کی ضرورت ہے جو ان دونوں (بظاہر متضاد) مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کر سکے: اور غالب ایسی شخصیتوں کا انتظار جو تازہ و شیریں پھلوں بھرے موسموں اور دوستوں کے خطوں کے انتظار کی لذت کو زندگی میں اتنی ہی جگہ دے سکیں جتنی کہ فلک کی گردش اور دمسازیِ مہر و ماہ کو!

ابھی تک اس نئے انداز نظر کے کوئی واضح آثار نظر نہیں آتے۔ ذہنی طور پر آج ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں بنی اسرائیل اپنی ہجرت کے فوراً بعد پہنچے تھے۔ ہم ماضی و حال کو تو کوس سکتے ہیں لیکن کسی نئی تعمیر کا نقشہ ہمارے ذہن میں موجود ہی نہیں۔ اس زمانے کے سب سے طاقت ور نظریے (سوشلزم) اور بنی اسرائیلی عقائد میں گہری مماثلت، قربت ہے۔ یہودیوں کے اولیں صحیفوں میں آزادیِ نفس، روحانی کشاکش، بخشش اور شخصی نجات کا کوئی تصور نہیں۔ بقائے روح کا عقیدہ بھی بہت بعد میں پیدا ہوا۔ فرد معاشرے کا محض ایک بے نام و نشاں ذرہ تھا۔ خدا افراد کے بجائے، قوموں اور قبیلوں سے مخاطب ہوتا تھا اور انھیں جزا و سزا کا مستحق سمجھتا تھا۔ خوش ہو کر ان میں نبی اور بادشاہ بھیجتا، ناراض ہو کر ان سے در بہ در کی خاک چھنواتا۔ انفرادیت پر ملی اور اجتماعی تخیل کی فضیلت سوشلسٹ نظریے کا بنیادی رکن ہے۔ اس کے علاوہ مادی ضروریات کے معاملے میں بھی سوشلسٹ اور یہودی، ہم خیال ہیں۔ یہودی ذہنیت، روح اور ضمیر کی جنت، دوزخ سے متاثر ہونے کے بجائے، جاہ و حشم کی خاطر یا مادی وسائل کی شادابی و فراوانی کے حصول کے لیے نیکی اور خدا ترسی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پرولتاری بھی خدا کے برگزیدہ بندے لیکن زمانے بھر کے مظلوم و مقہور عوام! ان کے خدا نے بھی زمین کی بادشاہت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تاریخ کا واضح اور روشن ادراک دونوں میں مشترک ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستان دونوں کو ازبر ہے؛ لیکن دونوں کے عقائد یکساں طور پر داخلی احساس سے تہی اور آزادی کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔

آج مشرق میں اشتراکی ہمہ اوست کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر مغربی اقوام پر یہ ہراس طاری ہے مبادا کہ اس خودی کی قندیل کو، جسے انسان صدیوں سے اپنے سینے میں چھپائے پھرا ہے، اس قلزم ضرضر کی موجیں ہمیشہ کے لیے بجھا دیں۔ فرانس کے فلسفۂ وجودیت (Existentialism) میں ازمنۂ وسطیٰ کی پوری رہبانی ذہنیت جلوہ گر ہے جو زندانِ نفس کی دیواروں سے باہر نہیں جھانک سکتی۔ مغرب کی مصوری اور شاعری بھی محبوس داخلیت کا رنگ اختیار کر چکی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ

مشرق، جو ہمیشہ سے داخلیت کا پرستار رہا ہے، ایک بے رُوح اسلوبِ حیات کو اپنانے کے لیے مضطرب ہے اور مغرب اُنھیں بتوں کا قتیل ہے جن سے وہ عرصے تک دشمنی کرتا رہا ہے!

خود اپنے منہ سے یہ بات بھلی نہیں لگتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تضاد و کشاکش کا حل اگر کسی کے پاس موجود ہے تو وہ یہی خاکستر اور مفلوج تہذیب ہے جس کے وارث اس برِعظیم کے رہنے والے ہیں۔ ہمیں نے اس آویزش کو پورے طور سے سمجھا اور محسوس کیا اور اس سے اُوپر اُبھرنے کے راستے دریافت کیے۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے صوفیا ہی کو لیجیے: یہ لوگ تزکیۂ باطن میں مشغول رہنے کے ساتھ ساتھ، عوام میں گھل مل کر دین کی اشاعت اور اُمرا و سلاطین کی مشیری کو بھی اپنا فرض جانتے تھے۔ اُردو غزل، جو ہمارے کلچر کی ایک خاص مظہر ہے، اسی دو رنگی کو ایک اور طرح سے پیش کرتی ہے۔ اس کی اشاریت میں داخلی تجربے کا پورا ارتعاش اور تموّج موجود ہے، اور اس بے کلی کے ساتھ ساتھ وسعت، ہمہ گیری اور عام فہمی بھی شامل ہے۔ ہمارے زمانے میں اقبال نے اپنے تجربے سے تہذیب کی اس کرن کے ساتوں رنگ نکال کر سامنے رکھ دیے: جن واضح الفاظ میں اُس نے خودی کی تکمیل اور ربطِ ملت کے نصب العین میں توازن و آہنگ پیدا کیا ہے، اُس کی مثال اس دور کے پورے مغربی تفکر میں نہیں ملتی۔

وزیر آغا نے اپنی اس کتاب میں جن پہلوؤں سے مسرت کے فلسفے اور نفسیات کا جائزہ لیا ہے، اُن میں ہمیں وہی دو دریاؤں کے سنگم کی سی کیفیت نظر آتی ہے...... جیسے گنگا اور جمنا کے ملنے سے سرسوتی جنم لے رہی ہو مصنف نے مسرت کا جو ہمہ گیر تخیل پیش کیا ہے، اُس میں شفق کے بدلتے ہوئے رنگوں کی جھلک اور زندگی کے لمحاتِ گریزاں کا عکس بھی ہے اور ابدیت کی گونج بھی۔ اُس کی نظر میں وہ ایک ہی جذبہ ہے جو کبھی جنسی محبت کا روپ بھرتا ہے اور کبھی جمالیاتی ذوق یا صوفیانہ وجدان کے لبادے میں ظاہر ہوتا ہے۔ محبت، ماورایت اور حسن و جمال اس کتاب کے تین خاص موضوع ہیں۔ کتاب کا ایک پورا باب آرٹ سے متعلق ہے جس میں جمالیاتی احساس اور تخلیقی عمل کی توضیح پیش کی گئی ہے۔ ان تصورات کے تجزیے میں مصنف نے جس بصیرت کا ثبوت دیا ہے، وہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔

صوفی کی نگاہ، مناظر و اشیا پر نہیں جمتی۔ وہ حسنِ بے حجاب کا تماشائی بننا پسند کرتا ہے۔ اس کے برعکس فن کار کا کام محض صورت گری ہے...... بے جان پتھر سے ایسی مورتیاں بنانا جن کی آنکھوں میں شرارے بھرے ہوں اور جن کا انگ انگ لچکے، بل کھائے۔ فن کار کی شانِ آزری، کسی عام عقیدے

کسی منطق یا بنے بنائے اُصول کا سہارا نہیں لیتی۔ اُس کے کام میں ایک اپنا قرینہ ہوتا ہے' ایک اپنی انوکھی منطق ہوتی ہے۔ اُس کی نگاہ ہر شے کو نئے انداز سے دیکھتی ہے: لفظوں' رنگوں یا آوازوں کی دُنیا میں ایک نئی شیرازہ بندی کرتی ہے: اور ہر بار تندیٔ صہبا سے پگھلا ہُوا آبگینہ' ایک نئی شبیہ اختیار کرتا ہے...... اسی عمل کا نام تخلیقِ فن ہے!

فن کار کا کام صرف یہی نہیں کہ ہم تک وہ اپنی آواز پہنچائے یا اپنے جذبات کی صحیح ترجمانی کرے: اس مقصد سے کہیں زیادہ اہم وہ درخشانی و تابندگی ہے جسے وہ تاریک و مبہم محسوسات میں پیدا کر دیتا ہے۔ فن کے قالب میں ڈھل کر' انسانی جذبات کی ماہیت یکسر بدل جاتی ہے۔ فن کے معکوس تجربات میں وہ گراں باری' گرفت اور دَم روکنے والی شدّت نہیں ہوتی جو اصل جذبوں میں پائی جاتی ہے: اس کی جگہ کشادگی' سبکساری اور رفعت کا احساس جاگ اُٹھتا ہے جو ذہن کو گرد و پیش کی سلاسل سے نجات دلوا کر' ایک بلند تر شادمانی سے ہم کنار کر دیتا ہے۔

فن کی جاذبیت کا ایک اور سبب اس کی وہ دو رنگی خصوصیت ہے جو اپنے اندر بیک وقت تموّج و سکون' ارتعاش' آسودگی اور شعلہ و شبنم کی کیفیات کو سموئے رکھتی ہے۔ ہر فن پارہ خواب اور نشے کا عجیب و غریب امتزاج پیش کرتا ہے۔ خواب کا تعلق تخیلات کی نزاکت اور حُسن سے' اُن کی بوقلمونی اور فراوانی سے' نیرنگِ نظر اور حیرت و تماشا سے ہے۔ نشہ فقط تپش' اضطراب' خود آرائی و خود فریبی' ہنگامہ و شوریدہ سری' رقص اور راگ رنگ کا دوسرا نام ہے۔ نشے کی کثافت' گراں نشینی اور حدّت کس طرح خواب کی مافوقیت سے نمو پا کر اعلیٰ فن کو جنم دیتی ہے...... نفسیاتِ جمال ابھی تک اس عمل کو پوری طرح بیان نہیں کر پائی۔ اس کتاب کے مصنف نے اس سلسلے میں "آرٹ اور مسرت" کے زیرِ عنوان' بعض خیال افروز باتیں کہی ہیں جو غور و فکر کی محتاج ہیں۔ جس فعل کو ذہن کا عمل رابطہ کہتا ہے' یہ وہی لمحاتی لمس ہے جو پیاس سے جلتے ہوئے لبوں اور پہاڑی چشمے کے سرد و شیریں پانی کے مابین پیدا ہوتا ہے: یہ لمس صرف تخلیقِ فن و ادب ہی کا محرک نہیں! انسانی فکر و نظر کی دوسری شمعیں بھی اسی لمحۂ حیات افروز کے فیضان سے روشن ہیں۔

انسان کے ذہن پر صوفیانہ تصوّرات کا اُتنا ہی گہرا اثر پڑتا ہے جتنا کہ فن و ادب کے کارناموں کا' یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ انسان اور کائنات کا باہمی رشتہ اُتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ جنس کا یا روٹی کا سوال: پھر اس مسئلے سے اتنا گریز کیوں! اتنی پردہ پوشی کیوں! انسان اپنی ذات اور اجزائے آفرینش میں کیسے ربط و ہم آہنگی تلاش کرتا ہے...... اُس کے رُوحانی اور جمالیاتی تقاضوں کی نوعیت کیا ہے......

زندگی کی وحدت و یکتائی کا احساس ذہن پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے...... اِن سب سوالوں سے جدید علوم (بالخصوص جدید نفسیات) نے جس طرح اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی ہے اُس سے ایک گہرا اعصابی خوف جھلکتا ہے۔ نفسیات، انسان کو مرکزی حیثیت بخشتی ہے اور ایسے تجربات کا تصور کرتے ہوئے جھجکتی ہے جو احساسِ خودی سے عاری ہوں۔ لیکن ہر زمانے میں ایسے لوگ ہو گزرے ہیں، جنھوں نے شخصی وجود کی اضافیت کو محسوس کیا اور قطرے کو دریا سے ہم کنار کر ڈالنے میں عمریں بتا دیں۔ ان تجربات کا سنجیدہ مطالعہ نفسیات کو ایک نئے اندازِ فکر سے رُوشناس کراتا ہے۔ یہ خیال پختگی پکڑنے لگتا ہے کہ نفس ایک وسیع و بسیط ارتقائی عمل کی محض ایک منزل، محض ایک ماندگی کا وقفہ ہے: اس کی کوئی دائم و قائم ازلی اور اساسی حیثیت نہیں اور یہ مفروضہ، نفسی حقائق کا ایک بالکل نیا تصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے: لیکن شاید ہم ابھی تک اس انقلاب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ وزیر آغا نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے اِن تجربات کی توجیہ کی ہے۔ اُن کے مطالعے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اِس میں غیر ضروری قطعیت، ہٹ دھرمی اور بے جا خود اعتمادی موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کا یہ پہلا قدم ایک دن باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لے اور ہم اُن مسائل کے متعلق غور و فکر کرنا شروع کر دیں، جن کے ذکر سے بھی آج بہت سے پڑھے لکھے لوگ کتراتے ہیں!

تصوف اور پرستشِ جمال میں ایک قدرِ خاص مشترک ہے۔ صُوفی کی بے خودی اور فن کار کی انتہائی خود بینی و خود آرائی بظاہر متضاد کیفیتیں ہیں لیکن حقیقتاً فن کار اور صُوفی دونوں ایک ہی مقصد کے لیے جیتے ہیں...... ایک ایسی حالتِ جذب کے لیے جس میں ذات اور غیر ذات کا امتیاز باقی نہ رہے اور مکمل خود فراموشی میسّر ہو۔ تاہم تعشّق، تن و توش کے احساس کو مٹانے کے بجائے اُسے شدید تر کر ڈالتا ہے۔ تلاشِ حق اور تلاشِ جمال کی طرح محبت کا بنیادی محرک بھی تنہائی اور بے بسی کا احساس ہے۔ لیکن عاشق (صُوفی اور فن کار کی طرح) اُس حدِ فاصل کو فراموش نہیں کرتا جو ایغو کو کائنات سے جدا کرتی ہے۔ عشق کی تکمیل کے لیے محبوب کا جسمانی وجود لازمی ہے، لیکن عاشق کے لیے جنسی جذبہ محض ایک وسیلہ ہوتا ہے...... ایک ایسی زبان، جسے دُنیا بھر میں صرف دو افراد بول سکتے ہوں...... یہ ایک ایسا راستہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں! جب دو آئینے ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیے جائیں تو عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بنتے چلا جاتا ہے: کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آخری عکس کون سا ہے...... یہی عشق کی کیفیت ہے! کوئی بات بھی آخری بات نہیں...... جنسی لذت، ہوس کی انتہا اور عشق کی ابتدا ہے۔ اِس کتاب کے

مصنف نے جہاں فلسفیانہ طور سے محبت کی تقسیم کی ہے وہاں اُن بندشوں اور اُلجھنوں کا بھی ذکر کیا ہے جو آئے دن مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کو تلخ اور بے کیف بنائے رہتی ہیں۔ عام طور پر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ انسان سیدھے خطوط صرف اپنے ہاتھ سے کھینچتا ہے: فطرت میں تو ہر طرف لہروں کا سا اُتار چڑھاؤ ہے...... ایک صوتی آہنگ جو کبھی نرم و نازک ہے اور کبھی تند و تیز! سب سے بڑی بات یہی ہے کہ آدمی اس تھاپ کو پُورے طور سے جانے اور اس سے قدم ملائے رہے۔ مرد اور عورت کی چاہت میں بھی یہی زیر و بم ہے...... دھوپ چھاؤں کا منظر! جنسی کشش اور طلب کے ساتھ ساتھ گریز اور فرار کا جذبہ بھی ایک حیاتیاتی حقیقت ہے اور مسرت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ چاہنے اور چاہے جانے والے اس حقیقت سے کبھی بے خبر نہ ہوں۔ "محبت اور مسرت" کے عنوان سے مصنف نے اس موضوع پر ایک پُورا باب لکھا ہے جو نظریاتی لحاظ ہی سے دلچسپ نہیں، ہماری زندگی سے نہایت قریب ہونے کے سبب ایک نفسیاتی مشورے کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے افکار و نتائج محض کتابی مطالعے اور غور و فکر کی پیداوار نہیں...... اس کاوش میں اُن کے ذاتی حالات اور اُن حالات سے اُبھرنے والے اندازِ نظر کو بہت دخل ہے۔ اس لیے اُن کے شخصی تعارف کے بغیر یہ دیباچہ نامکمل رہ جائے گا۔ جب وزیر آغا نے پہلے پہل مجھ سے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ مسرت کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنا چاہتے ہیں تو مجھے یہ سمجھنے میں دشواری ہوئی کہ انھوں نے اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا ہے۔ اُردو ادبیاتِ حاضرہ میں تو اس موضوع کی کوئی روایتی حیثیت نہیں اور نہ ہی ہنگامی لحاظ سے یہ موضوع کوئی مقبولیت رکھتا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب لوگ کسی بنیادی بات کا ذکر بے جھجک چھیڑ دیا کرتے تھے اور دھیمے دھیمے سلجھے انداز سے بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے۔ ایک بار جب میں اُن کے گاؤں میں جا کر رہا تو مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے سوچا کہ وہ باتیں جو وزیر آغا نے اپنے مقالوں میں علمی اور غیر شخصی انداز سے کہی ہیں اُن کے کہنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے گاؤں کے متعلق ایک ناول لکھتے۔ غالباً اس مختصر سے قیام کے تاثر کو ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کی خاطر ہی میں دوبارہ اُن کے گاؤں نہ گیا۔ اس گاؤں کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا میرے لیے ناممکن ہے۔ یُوں سمجھ لیجیے کہ گاؤں کی زندگی بیک وقت خاموش بھی ہے اور متلاطم بھی اور اس سے وابستہ ہر شخص ایک مکمل فلسفۂ حیات کا نمائندہ ہے اور ایک مشین کی طرح اپنے مسلک کا اعلان کیے جا رہا ہے۔ اس ماحول میں وزیر آغا ہی ایک ایسا انسان ہے جو کسی

نظریے کا تابع نہیں۔ وُہ خاموشی سے سب کچھ سنتا ہے...... ایک غیر مخل اُور صاحبِ بصیرت تماشائی ہے۔ بڑے آغا صاحب اُور کریم بخش کے ساتھ ایک دوپہر میرے حافظے میں ہمیشہ روشن رہے گی۔ بڑے آغا صاحب، ویدانت پر غیر معمولی طور سے حاوی ہیں؛ اُور جس طرح وُہ (بڑ کے) درخت کے نیچے بیٹھے، سیدھی سادی پنجابی میں، آس پاس کے دیہات سے آئے ہُوئے لوگوں کو اِس نظریے کی تلقین کرتے ہیں...... وُہ منظر اِس بیسویں صدی میں غیر حقیقی سا نظر آتا ہے۔ کریم بخش محض ایک دہقان ہے۔ میں نے اُس سے خیر و شر کے متعلق پُوچھا تو اُس نے صرف اِتنا کہا:

بُرائیاں اگر لوہے کی بیڑیاں ہیں تو نیکیاں سونے کی بیڑیاں ہیں!

اس گاؤں کے بعض کرداروں کا ذکر آپ کو اِس انوکھی کتاب میں ملے گا۔ شمس آغا مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق غالب نے کہا ہے:

کیا پُوچھو ہو وُجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

چنت رام اُور دلاور خاں اپنی اپنی جگہ مکمل اِنسان ہیں۔ وزیر آغا اپنی صبح، مالٹے کے باغوں کی دیکھ بھال میں صرف کرتے ہیں؛ واپس آ کر زمین داری کا حساب دیکھتے ہیں؛ یا مردانے میں بیٹھ کر کچھ پڑھتے لکھتے ہیں؛ اُور شام کو اُن پگ ڈنڈیوں پر میلوں گھومتے ہیں جن کی گرد ڈوبتے ہُوئے سُورج کی شعاعوں میں سونے کے ذرّوں کی طرح چمکتی ہے...... یہ ہے وُہ زندگی، جس نے اُن خیالات کو جنم دیا جو ایک سادہ مگر دلکش نگارش کے سلسلۂ زریں میں آپ کے پیشِ نظر ہیں۔

وجیہ الدین احمد

maablib.org

مسرت

مسرت ......؟ یہ سوچنا غلط ہے کہ زیادہ آسائش زیادہ مسرت کا منبع ہے۔ مسرت آتی ہے گہرے طور پر محسوس کرنے سے، سادگی سے لطف اندوز ہونے سے، تخیل کی آزاد اُڑان سے، زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے، دوسروں کے کام آنے سے!

سٹارم جیمز سن کے اِن الفاظ کی صداقت پر کیونکر شبہ ہو سکتا ہے!

لیکن زندگی اِس قدر بسیط اور اِس کی اقدار اِتنی پیچیدگیوں کی حامل ہیں کہ اِس کے متعلق کوئی بھی سطحی بیان، تسکینِ قلب کا مُوجب نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ کلبلاتے ہوئے اِس دور میں خوشی اور غم کا لاینحل مسئلہ ایک باقاعدہ مرض کا درجہ اختیار کر چکا ہے، لہٰذا اِس پر ایک گہری نظر ڈال کر کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی کمزور سے کمزور سعی بھی باعثِ مسرت ہو سکتی ہے...... مسرت! ...... وُہی مسرت جسے میں نے اپنے مطالعے کا عنوان کیا ہے۔

لیکن مسرت آخر ہے کیا؟ اور کس حد تک اِسے غم سے متمیز کیا جا سکتا ہے! اگر علم النفس کی جدید ترین تحقیقات محبت اور نفرت کو ایک ہی تصویر کے دو رُخ قرار دے سکتی ہیں؛ اگر اِن تحقیقات کی روشنی میں احساسِ برتری اور احساسِ کمتری کے مابین صرف ایک لطیف سا پردہ ہی حائل ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خوشی اور غم کی سرحدیں بھی پھیلتے پھیلتے ایک دوسرے میں مدغم نہ ہو گئی ہوں اور ہمارے لیے اُن کے درمیان خطِ فاصل قائم کرنا ایک مصیبت نہ بن گیا ہو...... مگر خطِ فاصل تو قائم ہے کہ مسرت غم نہیں ہو سکتی اور غم مسرت نہیں ہو سکتا...... یہ دو مختلف کیفیات ہیں جو انسانی زندگی کے تاروں کو اتنی شدت سے مرتعش کرتی ہیں کہ انسان لرز اُٹھتا ہے...... یہ اَور بات کہ اِن میں سے ایک! اپنے اِرتقا میں شگفتگی اور

والہانہ پن کے سہارے بہتے ہوئے زندگی کو ایک نشاط انگیز رقص میں تحلیل کر دیتی ہے اور دوسری اپنی انتہا میں اس کا ہاتھ پکڑ کر ایسی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے جہاں تیرگی اور بے بسی کے شدید احساس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں، مگر ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی کیفیت نہ تو ابدیت کی حامل ہے اور نہ ہی کسی ایک کا وجود دوسری کے قطعی استیصال سے قائم رہ سکتا ہے۔ مسرت کا مزہ کچھ وہی جانتا ہے جس نے غم کی چاشنی کو بھی چکھا ہے اور غم کی خلش کچھ اُسے ہی ستاتی ہے جس نے مسرت و نشاط کا جام بھی پیا ہے...... یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور زندگی نام ہے اس دوڑ کا جو ان دو سرحدوں کے درمیان ازل کے روز سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

تجربہ اور تاریخ شاہد ہے کہ انسان روزِ آفرینش ہی سے مسرت کا طالب رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت جن مستثنیات کے تابع ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بعض لوگ مسرت کے بجائے غم کے جویا ہوتے ہیں: ایسے لوگ خود اذیتی (Masochism) کے تحت اپنی ذات کو دکھ میں ڈال کر حظ اٹھاتے ہیں اور قنوطیت کے پیہم تھپیڑے سہہ سہہ کر اس کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ان پر تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اس زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو غم کو مثبت (Positive) تصور کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مطابق مسرت بذاتِ خود کوئی چیز نہیں یہ فقط غم کے فقدان کا نام ہے...... اپنے اسی خیال کو زیادہ صاف الفاظ میں وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ مسرت ایک سیاہ بلّی ہے جسے کوئی اندھیرے کمرے میں ڈھونڈ رہا ہے جبکہ وہ وہاں نہیں ہے۔ اور اسی زمرے میں اُن لوگوں کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے اپنے اوپر گھناؤنی زندگی کی تمام صعوبتوں کو روا رکھتے ہوئے دوسروں کے لیے میدان صاف کیا اور خود چپ چاپ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ابدی تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ اس ضمن میں چارلس ڈکنس کے معروف کردار سڈنی کارٹن کی لازوال قربانی کی مثال دی جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم اس کردار کے ان آخری الفاظ کو یاد رکھیں:

> یہ کتنا نفیس قدم ہے جو میں اُٹھا رہا ہوں...... ان سے ہزار گنا اچھا جو میں نے آج تک اُٹھائے ہیں! میں ایک ایسے سکھ اور آرام کی طرف گامزن ہوں جس سے میں آج تک محروم رہا۔

نفسیاتی لحاظ سے بھی یہ نقطہ قابلِ غور ہے کہ ہم اکثر ٹریجڈی کو کامیڈی سے زیادہ وزنی قرار دیتے ہیں اور مقدم الذکر کی تاریک فضا میں ہمیں وہ تسکین حاصل ہوتی ہے جس کی واقعی ہمیں ضرورت ہوتی ہے: لیکن ان تمام مثالوں میں جس اہم نکتے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ غم

دکھ، قربانی اور ٹریجڈی سے دراصل وہی مسرت حاصل کر لیتے ہیں جس کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ ان چیزوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ فی الحقیقت ہر انسان مسرت کی تلاش میں ہے۔ مگر اس سے قبل کہ میرے اس فقرے سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے، میں مسرت اور لذت کے مابین حدِ فاصل کی اُن لکیروں کو شوخ تر کر دینا چاہتا ہوں جو ان دونوں کیفیات کو نمایاں کر سکیں۔ لذت ایک حسیاتی چیز ہے اور اس کا زیادہ تر تعلق جسم سے ہے۔ ہم اپنی پانچ حسیات (سونگھنے، چکھنے، چھونے، سننے اور دیکھنے) سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان میں سے جسم کے ساتھ کسی لطف کا جتنا زیادہ تعلق ہو گا اتنا ہی وہ مسرت کی بہ نسبت، لذت سے زیادہ نزدیک ہو جائے گا۔ آسمان کی نیلی سی جھیل میں تیرتے ہوئے بادل کے ایک ٹوٹے کی جھلک، یا موسیقی کی کوئی مدھر دھن، یا کسی ایسی ہی کیفیت سے مسرت کی ایک ہلکی سی موج ہمارے سراپے سے ٹکرا کر پھر غائب ہو جائے...... اس لذت سے کافی مختلف ہو گی جو مثلاً کوک شاستر کی کسی برہنہ تصویر کو دیکھ کر یا کباب کا ایک ٹکڑا کھا کر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن شاید میری دلیل ابھی تشنہ ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں مسرت اور لذت میں وہی تفاوت ہے جو محبت اور شہوت میں ہے، تخیل اور حقیقت میں ہے، روح اور جسم میں ہے۔ مسرت، لذت ہی کی ترقی یافتہ صورت کی مظہر ہے۔ لذت جسم سے وابستہ ہے، مسرت روح سے متعلق ہے۔ لذت انسانی حسیات کی مرہونِ منت ہے، مسرت اُن روحانی کیفیات کے تابع ہے جن کا محرک کوئی خارجی منظر ہوتا ہے لیکن جو روح کی کسی غیر محسوس لہر سے جنم لیتی ہیں...... اگرچہ یہ چیز بسا اوقات صرف چند لمحات تک پائیدار ہوتی ہے، تاہم ان چند لمحات میں وہ زندگی کو اتنا کچھ بخش جاتی ہے جو بیش بہا خزانوں پر بھی بھاری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ کے ایک مشہور جریدے (Reader's Digest) کے ایک بلند پایہ مضمون کا تذکرہ مناسب ہو گا جس میں اُس مریض کے چند نہایت پُر مسرت لمحات کا بیان ہے جو اس نے تپ دق کے بعد یک لخت محسوس کیے جب اُسے بالکنی میں ایک پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا اور اس کے سامنے ایک کبڑے سے درخت پر بہار کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ یا پھر ہم اس مسرت کو شیلے کے اس زندۂ جاوید مصرع سے پھوٹتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں:

I shrieked and clasped my hands in ecstacy.

اسی طرح شمس آغا کے مشہور افسانے سراب میں بھی ایک جگہ ہیرو خارجی مناظر کے ٹکراؤ سے مسرت کی ایک ایسی ہی والہانہ لہر محسوس کرتا ہے:

> وہ رُک گیا اور چاند کا چہرہ کانپتے ہوئے پانی میں جھلملانے لگا۔ اُس کا دِل چاہا" وہ فرطِ کیف سے چیخیں
> مارے...... درخت بے حس و حرکت کھڑے تھے؛ جھاڑیاں دم روکے ہوئے تھیں؛ لانبی لانبی گھاس میں بھی آ
> گئی تھی چاروں طرف جمود تھا اور خاموشی...... ہاں دُور کہیں دُور، میلوں پرے کوئی بنسری بجا رہا تھا۔
> اُس کا دِل چاہا" وہ پتھر پر کھڑا ہو کر بنسری بجانے والے کو آواز دے؛ اُسے اپنے پاس بلائے یا خود بنسری
> بن کر اس کے جاگتے ہوئے لبوں سے جا لگے اور نغمہ بن کر کائنات کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے!

آپ نے دیکھا، مسرت کی یہ لہریں کتنی تیز رفتار ہیں؛ اور انھوں نے کس طرح محسوس کرنے والوں کی رُوحوں کو مرتعش کر دیا ہے! زندگی میں ایسے لمحات بہت کم آتے ہیں؛ بیشتر اوقات تو رُوح کی پرواز، ماحول کی سنگین دیواروں ہی میں پھڑپھڑا کر رہ جاتی ہے۔

مگر مسرت کی اس توضیح کے بعد یہ کہنا کہ ہر انسان اسی مسرت کی تلاش میں ہے غالباً صحیح نہیں ہوگا۔ مسرت کی ان پُر زور لہروں کو پانے کی شعوری یا غیر شعوری آرزو ہر انسان کے ذہنِ نارسا کی منزل نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک عام انسان مسرت کی اَن گنت چھوٹی چھوٹی لہروں کا تمنائی ضرور ہوتا ہے جو لذت، سکون اور تکلیف کے مدوجزر سے پیدا ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ "تکرار" سے ان میں سے ہر کیفیت کی شدت میں انحطاط لازم آتا ہے اور یہی تکرار آگے چل کر یکسانیت اور ٹھہراؤ کی فضا پیدا کر دیتی ہے؛ لہٰذا ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بھی آرزو کرتے ہیں کہ زمانے میں تغیّر کو ثبات رہے اور لذت، سکون اور تکلیف کا مدوجزر قائم رہے۔ دراصل ہم انسان فطری طور پر تلوّن پسند ہیں؛ ہم تبدیلی چاہتے ہیں؛ چاہے یہ تبدیلی ماحول میں ہو، جسم میں یا خیالات میں ہو! اور فی الحقیقت ہماری زندگی نیز بھی یکسر نہ ہوتی تو ہم کبھی کے اس سے اکتا گئے ہوتے، تھک ہار کر بیزار ہو چکے ہوتے؛ مگر بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی جسمانی اور ذہنی تبدیلیوں سے دوچار ہو کر اور گردشِ فلک اور ماحول کے نت نئے انقلاب کے طفیل؛ ہم نے خود کو جمود، تعطل اور زندگی کی سنگلاخ یکسانیت سے بچا لیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان صرف سکون کی تلاش میں ہے؛ بعض کا خیال ہے کہ اُسے صرف لذت چاہیے؛ بعض رنجیدگی کو اُس کی منزل قرار دیتے ہیں لیکن درحقیقت انسان ان میں سے کسی بھی خاص کیفیت کا جویا نہیں؛ وہ تو زندگی کے اُس مدوجزر کا خواہاں ہے، جس کے طفیل وہ مسرت کی ہلکی ہلکی لہروں سے مستفید ہو سکے؛ وہ تو زندگی کے ایسے سمندر کی تلاش میں ہے، جس میں طوفان بھی آئے اور جس پر سکوت بھی طاری ہو مگر جس کی سطح پر ننھی ننھی لہریں ضرور مچلتی رہیں۔ بڑے پیمانے پر بھی دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ فردی زندگی لامتناہی ہوتی تو اس زندگی کا سارا حسن، اس کی کشش اور والہانہ پن، اس کی کرخت یکسانیت میں

تحلیل ہو کر رہ جاتا اور حیات و موت کی دھوپ چھاؤں سے محروم ہو کر زندگی خود سپاٹ اور چٹیل ہو جاتی۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

اور اگر ہم اس منطق کو تسلیم کر لیں کہ انسان ٹھہراؤ اور یکسانیت سے کنارہ کش ہونے کا آرزو مند ہے تو ہمیں زندگی کے ہر اس نظام کی پائیداری پر شک گزرے گا جس میں مد و جزر کے امکانات صفر کے برابر ہوں...... اور شک کیوں نہ ہو جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسان غم کو برداشت کر سکتا ہے لیکن یکسانیت اور ٹھہراؤ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ایمرسن نے ایک جگہ لکھا ہے:

ہم خوبصورتی میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن اُسے دیکھنے کے لیے ہمارے پاس آنکھیں نہیں۔

آنکھوں سے اس کی مراد دل کا وہ میلان (response) ہے جس کے طفیل کائنات کا حسن حقیقت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے ایک حساس دل کی ضرورت ہے، ورنہ بیشتر لوگ تو وجدانی کیفیات سے اس درجہ اجنبی ہوتے ہیں کہ کوئی خوبصورت منظر بھی اُن کی روحوں کو بلند نہیں کر سکتا اور وہ مادیت کے قصر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ اس ضمن میں اُن سیاحوں کا تذکرہ بھی غیر مناسب نہیں جو پہاڑوں پر صرف تاش اور کیرم کھیلنے اور پوسٹ آفس کے سامنے کھڑے ہو کر چلغوزے اور بادام کھانے کے لیے جاتے ہیں...... ایسے لوگ مسرت سے محروم رہتے ہیں، البتہ اس محرومی سے گھبرا کر زیادہ سے زیادہ جسمانی لذت حاصل کر لینا چاہتے ہیں...... فی الحقیقت خوبصورتی کو دیکھنا، دوسروں کو دکھانا اور اس سے لطف اندوز ہونا بہت بڑی بات ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ انسان کسی بھی چیز کو ایسی دلچسپی سے دیکھے گویا اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہو...... ایسا کرنے سے نئی نئی وہ باتیں اس پر منکشف ہوں گی جنھیں وہ سطحی نظر میں نظر انداز کر گیا تھا۔ دراصل جدت اور تبدیلی ہی مسرت کی سب سے بڑی معاون ہے اور خوبصورتی جو مسرت کی مستقل رفیق ہے، بذاتِ خود ایسے رنگوں کا امتزاج پیش کرتی ہے جو ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح غائر نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ کائنات بھی ہر لحظہ تبدیل ہو رہی ہے، اس میں نیا پن آ رہا ہے۔ صرف گہری نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ سردی کے بعد بہار اور بہار کے بعد گرمی کیوں آ جاتی ہے! کائنات کی دوسری اہم تبدیلیوں سے قطع نظر اگر محض یہ موسمی تبدیلیاں

ہی معرضِ وُجود میں نہ آتیں تو یکسانیت اَور ٹھہراؤ کے ماحول میں ہمارے خیالات اَور احساسات میں بھی تعطل اَور جمود پیدا ہو جاتا اَور ہر چیز پر ایسی گھٹن کی فضا کا تسلط ہو جاتا جو زندگی کے لیے مہلک ثابت ہوتا۔

ایک مشہور انشا پرداز نے زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

> خواہشات اِنسانی فطرت کا ضروری جزو ہیں۔ اِنسان خواہش کرتا ہے اَور اَپنے افکار و احساسات کے لیے ایک منزل متعین کر لیتا ہے۔ تب اُس منزل کے لیے کشاکش اَور تگ و دَو میں مصروف ہو جاتا ہے' لیکن جب وُہ منزل پر پہنچ جاتا ہے تو یہ دیکھ کر اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ اُس منزل نے تو اُسے وُہ تسکین ہی مہیا نہیں کی جس کا وُہ طالب تھا۔ دراصل اِسی دوران میں اُس نے ایک نئی منزل کی طرف اپنے احساسات کے دھارے کو موڑ لیا تھا۔
>
> غم زدہ لوگ وُہ ہوتے ہیں جو یا تو زندگی کے اِتنے نچلے مقام پر کھڑے ہوتے ہیں کہ اُنھیں اپنی خواہشات کی تکمیل کی اُمید ہی نہیں ہوتی؛ یا وُہ لوگ جو زندگی کے زینے کے اُوپر والے اُس تختے پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں زندگی کی تمام سہولتیں مل جاتی ہیں اَور اُنھیں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کوئی بھی کوشش نہیں کرنا پڑتی۔

کشاکشِ حیات کے متعلق یہ خیالات حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں' اَور میرے اِستدلال کے سلسلے کو اِس حد تک تقویت پہنچاتے ہیں کہ مسرت کی اَن گِنت چھوٹی چھوٹی لہروں سے مستفید ہونے کے لیے جس کشمکش اَور تگ و دَو کو میں نے ضروری تصور کیا تھا' اُسے یہ بھی ناقابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔

اَب ذرا اَور گہری نظر سے دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ زیست کے صحرا میں مسرت ایک ایسی عمارت ہے جو تین عظیم الشان ستونوں پر کھڑی ہے:

(الف) معصومیت ۔ (ب) صحت (ج) خواب

جہاں تک معصومیت کا تعلق ہے' اِس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ذہنی ترقی اَور معصومیت ایک دُوسرے کی ضد ہیں یعنی جہاں ذہنی ترقی کا آغاز ہونے لگتا ہے' وہاں معصومیت فنا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اَب چونکہ ذہنی ترقی سے رازہائے سربستہ فاش ہوتے ہیں اَور رازہائے سربستہ ہی زیست کو خوشگوار اَور پُرکشش بنانے کے محرک ہیں لہٰذا جب "راز" کے پٹ کھل جاتے ہیں تو زندگی سپاٹ اَور چٹیل نظر آنے لگتی ہے اَور اُس سے مسرت حاصل کرنے کے اِمکانات رُو بہ زوال ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بہ رضا و رغبت زندہ ہی اِس لیے ہیں کہ کائنات ایک سربستہ راز ہے' جسے اَفشا کرنے کے لیے ہمیں زندگی بھر کبھی نہ ختم ہونے والی تگ و دَو کرنا پڑتی ہے۔ بچپن میں گھر کے دروازے کے باہر ہمارے لیے ایک

جہانِ عجیب بستا ہے۔ جب ہم ذرا بڑے ہو جاتے ہیں' ہمارا تجسّس ہمیں اُفق کی پہاڑیوں کے پار لے جانے کے لیے اُکساتا ہے؛ پھر ہم سمندروں کو عبُور کر کے اُن سے پرے کی عجیب و غریب دُنیا کو دریافت کرنے کے متمنّی ہو جاتے ہیں؛ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ہماری متجسّس نظریں اِس دُنیا سے ہٹ کر اَجرامِ فلکی کے سربستہ رازوں کو فاش کر دینا چاہتی ہیں؛ اور حقیقت یہ ہے کہ اِسی تجسّس' اِسی تگ و دو کا نام زندگی ہے اور یہ وُہی زندگی ہے جو مسرت کی سب سے بڑی معاون ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ جُوں جُوں انسان اِرتقا کی منازل طے کرتا جاتا ہے اور اپنے چاروں طرف پھیلے جہانِ رنگ و بُو کی لطافتوں اور کثافتوں کا تجزیہ کرنے لگتا ہے' تُوں تُوں اُس پر افسردگی کا غلبہ بھی بڑھنے لگتا ہے۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانی لطافت کو کثافت پر ترجیح دیتی ہے' خواب کو حقیقت سے زیادہ پائیدار اور مسرت انگیز تصوّر کرتی ہے؛ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ایک مذہبی رہنما ایک سائنس داں کی بہ نسبت زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے...... اِس لیے کہ سائنس' زندگی کی کرختی اور ٹھوس پن کو عریاں کرتی ہے اور بڑے ہی حزم احتیاط سے حیات کے معموں کو حل کرتے چلے جاتی ہے۔ لیکن اِس کے برعکس مذہب' کائنات کے محل کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے رازوں کی اَن گنت چلمنیں باندھ دیتا ہے اور اِن چلمنوں پر تشبیہوں اور استعاروں کی چمک دار جھالریں آویزاں کر دیتا ہے؛ اور انسان...... ظاہری شان و شوکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے والا اِنسان...... چپکے چپکے اور خوشی خوشی رُسوم و قیود کی سلاسل پہن لیتا ہے...... مگر پھر بھی وُہ اِس قید کو اِس آزادی پر ترجیح دینے میں اِس لیے حق بجانب ہے کہ مقدم الذکر اُسے مسرت اور آخر الذکر ایک سنگلاخ اور کرخت حقیقت مہیا کرتی ہے...... یہی وجہ تھی کہ میں نے معصومیت کو مسرت کا ستون قرار دیا اگرچہ مجھے اِس بات کا احساس تھا کہ یہ لفظ خاصا مبہم ہے اور چند غلط فہمیوں کا مُوجب بن سکتا ہے۔ دراصل معصومیت سے میری مُراد دل کی وہ کیفیت تھی جب سارا جہان ایک طلسم ہوش رُبا نظر آئے اور دل اُسے حل کرنے کے لیے متجسّس ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ایک معصوم بچّہ یا گنوار ایک جہاں دیدہ بُوڑھے یا ترقی یافتہ انسان سے کہیں زیادہ مسرت حاصل کرے گا اگر اُسے پہلی بار ریل گاڑی یا جہاز میں چڑھنے کا موقع میسّر آئے...... اِس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں خلا کا احساس دُکھ کا مُوجب ہے...... ایک بچّے یا گنوار کے لیے زمین کے نیچے' آسماں سے اُوپر اور زمین اور آسماں کے مابین' ہر چیز ایک پُراسرار دُھندلکے میں ملفوف ہے؛ وُہ اپنے محدود فکر و تخیّل کی اعانت سے ہر چیز کا اِدراک کرتا ہے اور جب اُن میں سے کوئی بھی شے عریاں ہو کر اُس کے سامنے آتی

ہے تو اُسے وہ مسرت حاصل ہوتی ہے جس پر ہم ترقی یافتہ انسان بھی رشک کر سکتے ہیں معصومیت اور جہالت (جہالت جس سے میری مراد زندگی کے رازہائے سربستہ کی بہتات ہے) کے الفاظ یہاں ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جو ہم نے شروع میں نکالا تھا یعنی راز (mystery) کا وجود مسرت کا موجب ہے۔ یہاں ہم اس بات کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں کہ راز، معصومیت کا مرہونِ منت ہے اور معصومیت ایک ایسی چھوئی موئی ہے جسے ایک بار گنوا کر ہم دوبارہ نہیں پا سکتے۔ ہمارا جو قدم ارتقا کی طرف اُٹھ جاتا ہے وہ واپس نہیں پلٹ سکتا۔ البتہ ذرا احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے یہاں اس بات کا بھی اظہار کر دینا چاہیے کہ میں مسرت حاصل کرنے کے لیے جہالت کا علم بردار نہیں ہوں اور میری یہ آرزو ہے کہ انسان اگر خوشی کا جویا ہے تو اُسے ارتقا کے باوجود معصومیت کا دامن نہیں چھوڑنا ہوگا، ہر شے کو اس نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنا ہوگی گویا اُسے وہ پہلی بار دیکھ رہا ہو!

مسرت کے دوسرے بڑے ستون "صحت" کا تذکرہ کرنے سے قبل میں معصومیت کی مندرجہ بالا بحث کو ختم کرتے ہوئے اس کے متعلق اپنے مجموعی تاثر کو بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں کہوں گا کہ معصومیت، بچپن کا طرۂ امتیاز ہے لیکن یہ جوانی میں بھی اپنی شان کو قائم رکھتی ہے۔ اگر بچہ اپنی نکھری ہوئی معصومیت کے طفیل، مسرت کی مچلتی ہوئی موجوں سے ہم کنار ہو سکتا ہے تو جوان بھی اپنے اطوار، میل جول، کاروبار حتیٰ کہ محبت میں، خلوص کی اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جو معصومیت کا دوسرا نام ہے۔ اسی خلوص سے اُسے مسرت کا خزینہ ملتا ہے لیکن جب دنیا اس کے خلوص کا جواب فریب سے دیتی ہے اور اُسے تجربات و حوادث سے دنیا کی عیاری اور مکاری کے راز معلوم ہونے لگتے ہیں تو آہستہ آہستہ (لیکن یقینی طور پر) وہ بھی ہر شے کو شک اور خوف کی نظروں سے دیکھنے لگ جاتا ہے...... یہ شک اور خوف زیادہ مہذب الفاظ میں "جہاں دیدگی" کہلاتا ہے۔ جہاں دیدگی ادھیڑ پن میں پروان چڑھتی ہے اور بڑھاپے میں خطرناک صورت اختیار کر جاتی ہے البتہ اس کے طفیل انسان مسرت کے ان معطر جھونکوں سے بتدریج محروم ہوتے چلا جاتا ہے جو اس کے خلوص اور معصومیت کی پیداوار تھے۔

معصومیت کے بعد مسرت کے دوسرے بڑے ستون صحت کی باری آتی ہے۔ صحت اور مسرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ ان کا رشتہ تو اس قدر ناقابلِ شکست ہے کہ ایک کا وجود دوسرے کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ آپ کو اپنے ڈاکٹر کی وہ ضرب المثل تو خوب یاد ہوگی کہ ایک صحت مند روح، صحت مند جسم ہی میں رہ سکتی ہے...... اس کی وجہ یہ ہے کہ جسمانی نظام کی ضعیفی یا معمولی سے معمولی خرابی

کا بھی اِنسانی احساسات وخیالات پر بہت بُرا اَثر پڑتا ہے۔ مریضوں کے سلسلے میں ہر اِنسان کا تجربہ ہے کہ وُہ چڑچڑے اُور بدمزاج ہو جاتے ہیں اُور اُن کے لیے زندگی کے عام مدّوجزر سے مسرّت حاصل کرنے کے اِمکانات رُو بہ زوال ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح بڑھاپے کے جسمانی اِنحطاط کا نمایاں اَثر اِنسان کے مزاج پر ضرور پڑتا ہے۔ ضعیف جسم مقابلۃً غم، غصّے، نفرت اُور ایسی ہی دُوسری چیزوں کی آماج گاہ جلد بن جاتا ہے اُور اِنسانی زندگی کے وُہ تمام پٹ زنگ آلود ہونے لگتے ہیں جن سے گزر کر مسرّت کی خوشبودار لپٹیں اِنسانی دِل کے دروازوں پر دستک دیا کرتی ہیں۔

ضعیف جسم کے طفیل خیالات واحساسات کا مریضانہ صورت اِختیار کر جانا تو عام سی بات ہے لیکن غور سے دیکھیں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ ماحول کی تبدیلی کا بھی اِنسانی خیالات واحساسات پر زبردست اَثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کرشن چندر کے گرجن کی وُہ شام یاد کیجیے جب سطحِ سمندر سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اِنسانی محبت میں لازوال پاکیزگی اُور رفعت آگئی تھی اُور اِس کا مقابلہ ہزاروں فٹ نیچے ٹوٹے ہوئے تاروں" کی پستی اُور خالص جنسی محبت سے کیجیے...... آپ کو اِنسانی خیالات پر ماحول اُور فضا کی تبدیلی کا اَثر نمایاں طور پر نظر آجائے گا۔ ماحول کی تبدیلی تو ایک طرف، نفسیاتی تحقیقات نے یہاں تک بھی کہہ دیا ہے کہ رنگوں کی تبدیلی سے اِنسانی حیات میں حیرت انگیز اِنقلاب رُونما ہونے لگتا ہے...... مثلاً آسمانی رنگ، اِنسان کو اُداس کر دیتا ہے لیکن اِس کے برعکس سُرخ اُور قوسِ قزحی رنگوں سے اِنسانی خیالات میں حرکت اُور زندگی دوڑنے لگتی ہے اُور ٹھہراؤ اُور یکسانیت کا وُہ تمام طلسم ٹوٹنے لگتا ہے جو مسرّت کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔

جہاں ایک صحت مند رُوح کے لیے ایک صحت مند جسم کی ضرورت ہے، وہاں ہم یہ اِضافہ بھی کر سکتے ہیں کہ ایک صحت مند جسم کو برقرار رکھنے کے لیے ایک صحت مند رُوح بھی نہایت ضروری ہے۔ یہاں آڈن کے وُہ الفاظ یاد کیجیے کہ خیالات کی پریشانی کا نتیجہ بیماری کی صورت میں بھی اِنسان پر نازل ہو جایا کرتا ہے۔ بیماری تو خیر ایک بڑی بات ہے، حیاتیاتی طور پر (biologically) بھی یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ خیالات اِنسان کے جسم پر بُری طرح اَثرانداز ہوتے ہیں۔ مثلاً خطرے کا شعور ہونے پر دِل کا یکبارگی زور سے دھڑک اُٹھنا، یا ہجومِ غم یا موجِ درموجِ مسرّت کے طفیل بھوک کا کم ہو جانا یا آنسوؤں کا اُمنڈ آنا صاف طور سے اِس اَمر کی غمّازی کرتا ہے کہ ہمارے خیالات شعوری سطح پر اُبھر آنے کے بعد فی الفور ہمارے جسم پر اَثرانداز ہوتے ہیں۔ اِس سلسلے میں چونکہ ہمارے عصبی نظام پر دباؤ پڑتا ہے اُور خون کی روانی متاثر ہوتی

بے اِنتہا جسم کے وُہ حصّے جو دُوسروں کی بہ نسبت زیادہ حسّاس ہیں (مثلاً آنکھ، دِل وغیرہ)، جلد ہی ہمارے خیالات کی زد پر آ جاتے ہیں۔ پس جب یہ کہا جائے کہ مسرت صحت مند جسم کی ہم رکاب ہے اور ایک صحت مند جسم کی برقراری کے لیے ایک صحت مند رُوح کی ضرورت ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مسرت حاصل کرنے کے لیے اِنتہائی ضروری ہے کہ اِنسانی خیالات و احساسات صحت مند حُدُود کے مابین اپنے مدّ و جزر کو قائم رکھیں اور کسی ایک سمت زیادہ جھک کر زندگی کو غم و اندوہ کی آماج گاہ نہ بننے دیں۔

لیلائے مسرت کے حصول کی اس پُراسرار اور دِلچسپ تگ و دَو میں، جس تیسرے ستون کا ہمیں سہارا لینا پڑتا ہے، اُس کی اساس زندگی کے خوابوں پر کھڑی ہے ...... زندگی ...... وُہی آرزُوؤں، اُمنگوں اور اُمیدوں کا ایک خواب انگیز تانا بانا جس کی ڈور کا ایک سِرا ہمارے دِل سے بندھا ہے تو دُوسرے سِرے سے ہم نے ستاروں کے جھروکوں سے ناتا جوڑ رکھا ہے، اور جب ان جھروکوں میں آرزُوؤں اور اُمیدوں کی حسین اور نازک اندام پریاں کھڑے ہو کر نُقرئی قہقہے لگاتی ہیں تو ہمارے دِل کی دھڑکنیں بھی سہ چند ہو جاتی ہیں۔ البتہ جب بھی ان میں سے کوئی ایک جھروکا ٹوٹ جاتا ہے تو دلِ غریب کو خاصے زور کا جھٹکا لگتا ہے اور عمرِ رواں کی کشتی تو ایک دفعہ ناخدا سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے۔

خواب، ہماری حیاتِ مفلس کے ایسے رفیق و غم گُسار ہیں کہ ان کے بغیر کائنات کا بے رنگ و بُو اور زندگی کی لطافتوں اور خوشبوؤں سے معرّا ہو جانا کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ یہ خواب ہماری ہر آن بدلتی زندگی پر کبھی آرزُوؤں، ارمانوں اور اُمیدوں کا رُوپ دھارے، کبھی یادوں کا لطیف اور نازک آنچل اوڑھے، اور کبھی ہوائی اُمنگوں کا لباس پہنے، ہلکے گہرے اور سُرمئی بادلوں کی طرح ہر لحظہ چھائے رہتے ہیں۔ میں اُن صُوفیوں یا ویدانتیوں کی بات نہیں کرتا جنھیں تمام زندگی ایک خواب نظر آتی ہے؛ میں تو اُن عام اِنسانوں کی بات کرتا ہوں جن سے اُن کے خواب چھین لیے جائیں؛ جن سے اُن کی تسکین اور سوچ ہتھیا لی جائے، تو اُن کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ بھی نہ نکل سکے اور وُہ پھولوں کی طرح مرجھا کر دوشِ ہوا پر پریشان ہو جائیں۔

خوابوں کے یہ لطیف اور باریک آنچل ہماری زندگی کے تمام اَدوار پر چھائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جہاں ہم ان کی مدد سے اپنی عمرِ رفتہ کو آواز دیتے ہیں، وہاں انھیں کے طفیل آنے والے مستقبل کو بھی رنگین اور پُراسرار بنا لیتے ہیں اور جب کبھی "حال" اپنی گھٹا ٹوپ کرخت یکسانیت کو لیے ہمارے سامنے آتا ہے، تو بھی ہم ہار کر، کھو کر، پڑھ کر، لکھ کر جیسے بھی بن پڑے، انھیں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے کرخت پن کے مقابلے میں خوابوں کی پُراسرار اور مسرت انگیز دُنیا، ایک دلچسپ

تضاد پیش کرتی ہے۔ اب زندگی اپنی تمام تر کرخت اور سنگلاخ یکسانیت کے ساتھ صرف ایک لمحے کے لیے پائیدار ہوتی ہے۔ یہ لمحہ جب گزر جاتا ہے تو ماضی بن جاتا ہے اور ماضی کے دھندلکوں میں اس کے کرخت پن کا بیشتر حصہ تباہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ زندگی کے ناسور بھی معدوم ہونے لگتے ہیں ...... اور وہی ایک زخم جو کسی وقت جان لیوا نظر آتا تھا' آہستہ آہستہ مندمل ہوتے ہوئے' ماضی کے پُراسرار دھندلکوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کے اس لمحے کے بعد آنے والے تمام لمحات' مستقبل کی امانت ہیں: ان کے کرخت پن کو اُمیدوں' آرزوؤں اور ارمانوں کے لطیف آنچلوں نے چھپا رکھا ہوتا ہے۔ البتہ جب وہ حال کے فانوس کے سامنے سے گزر کر ماضی کی سمت بڑھنے لگتے ہیں تو نظر ان لطیف آنچلوں کو پار کر کے ان کی اصلی صورت پر بھی جا پڑتی ہے اور دل کی اُمیدیں ٹوٹ کر آنکھوں میں شفاف سا بلوریں محل تعمیر کرنے لگتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ لمحہ زیادہ پائیدار نہیں ہوتا' جلد ہی ماضی بن جاتا ہے' وہ خلش جو اس ایک لمحے کے کرخت پن سے پیدا ہوئی تھی' آہستہ آہستہ (ختم ہوتے ہوئے) معدوم ہو جاتی ہے۔

دراصل کائنات کی تشکیل ہی کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی میں حال کا یہ لمحہ بہت زیادہ وسعت کا حامل ہوتا ہے' یا جن کے حال کا فانوس اتنا روشن اور تیز ہوتا ہے کہ مستقبل اور ماضی کے بیشتر حصے بھی اس کی زد پر آ جاتے ہیں' مسرت کے وجود سے کافی حد تک تہی دامن رہ جاتے ہیں ...... چونکہ زندگی کی کرخت یکسانیت کو زیادہ دیر تک برداشت کر سکنا ناممکن ہے' لہٰذا ایسے لوگ شراب' آرٹ' لیڈرشپ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی معاونت سے اس کرخت پن کو بھول جانے کی سعی جمیل کرتے ہیں اور شاید اسی کوشش میں ان کی بقا کا راز مضمر ہوتا ہے۔

یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی ہے' توں توں اس کے مستقبل کے خواب کمزور اور ضعیف ہونے لگتے ہیں اور ماضی کے خواب اُبھر کر زیادہ نمایاں اور پُراسرار ہو جاتے ہیں۔ جوانی میں ہمارے پیشِ نظر مستقبل کا وسیع آسمان ہوتا ہے۔ جس میں ہم اپنی آرزوؤں اور امنگوں کے پتنگ اور کنکوے اُڑاتے ہیں اور اسی میں ہمیں بے پناہ مسرت ملتی ہے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خوابوں کی جگہ پرانی یادیں لے لیتی ہیں اور انسان اُنھیں کو اپنا اثاثہ جان کر زور سے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیتا ہے۔ شاید میں مستقبل کے خوابوں کے ساتھ انصاف نہیں کر رہا کیونکہ عمرِ رواں کے ساتھ مستقبل کے خواب بھی تو پائندہ رہتے ہیں' یہ الگ بات کہ ان خوابوں کا مرکز وہی نہیں رہتا ...... پہلے

انسان فقط اپنے متعلق سوچتا تھا اب وُہ دُوسروں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ بقولِ کرشن چندر ...... پھول اپنی کلی میں، ہرن اپنے نافے میں، عورت اپنی بیٹی میں اپنی جوانی کی بہار دیکھتی ہے...... اور یہی چیز اُسے اس مسرّت سے ہم کنار کر دیتی ہے جو اپنی ذات پر مرکوز مستقبل کے خوابوں کی پیداوار تھی۔

اگر ہم ان خوابوں کے نفسیاتی پس منظر کی طرف رُجوع کریں تو ہمیں تصویر کا دُوسرا رُخ بھی نظر آ سکتا ہے اور ہم اُن خوابوں کو بھی زیرِ بحث لا سکتے ہیں جو مسرّت کو تو تحریک نہیں دیتے مگر انجام کار خواب بیں کو غم و اندوہ سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ نفسیاتی تحلیل کے مطابق جاگتے کے خواب (Day Dreams) شرم اور جھجک سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہاں خواب دیکھنے والا "خود کوزہ، خود کوزہ گر، خود گِلِ کوزہ" کے مصداق آپ ہی ہیرو، آپ ہی حاضرین اور آپ ہی تمام پلاٹ کا خالق ہوتا ہے۔ ان خوابوں میں دُوسرے کردار بھی ظاہر ہوتے ہیں لیکن اُن کا وجود سرتاپا ہیرو کے وجود کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ ہیرو کو خواب میں سے نکال دیجئے، تمام خواب ایک کچے گھروندے کی طرح دھڑام سے نیچے آ گرے گا! آرٹ اور لٹریچر میں بھی ایسے نمونے بکثرت ملتے ہیں جو ان خوابوں کے مشابہ ہیں: مثلاً فلمی کامیڈی یا اسی وضع کا دُوسرا لٹریچر جس میں ہیرو آخرش کامیاب رہتا ہے۔ ان نمونوں کی ہر دلعزیزی کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ ایک طرح کے جاگتے کے خواب ہی ہوتے ہیں جن میں دیکھنے والا ہیرو کو جذباتی طور پر خود میں مدغم کر لیتا ہے...... یہاں تک کہ ہیرو کے مصاحب اس کے اپنے مصاحب بن جاتے ہیں اور ہیرو کی کامیابی اس کی اپنی فتح!

جاگتے کے خواب اکثر، بیشتر خواب بیں کی اُن خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں جو حقیقت میں پُوری نہ ہو سکیں۔ مثلاً کمزور جسم کے لوگ خواب ہی خواب میں بڑے زبردست پہلوان بن کر حریف کو پچھاڑ دیتے ہیں، یا باؤلنگ کرتے ہوئے ایم سی سی کی پُوری ٹیم کو دس پندرہ منٹ میں آؤٹ کر دیتے ہیں۔ پھر جاگتے کے ایسے خواب بھی ہیں جو صرف محبوبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں...... اُسے کسی پہاڑ کی چوٹی سے گرتے ہوئے بچا لیا جاتا ہے، یا ڈاکوؤں کے نرغے سے چھٹکارا دلایا جاتا ہے، اور وُہ خوش ہو کر خواب بیں کو اُپنے ملائم بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہے: یا پھر جنسی خواب ہیں جو خطرناک مراحل میں داخل ہو کر جنسی خواہشات کی تکمیل کا باعث بن جاتے ہیں اور انسان زندگی کے اُن اَدوار میں داخل ہو جاتا ہے جو اُسے نیوراتی حالت اور مستقل ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

دراصل ہماری زندگی میں ایسے کئی مقام آ جاتے ہیں جہاں ہم حقائق کی سنگلاخ چٹانوں سے کترا کر خوابوں کی چھوٹی چھوٹی پگ ڈنڈیاں اختیار کر لیتے ہیں۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ خواب اس لیے ضروری ہیں کہ

اُن خواہشات کی شدت کو انحطاط پذیر کر دیتے ہیں جو حقیقت میں پوری نہ ہو سکیں: اور اس لیے بھی کہ آرزوؤں کی اصل تکمیل کی طرف یہ ایک ضروری قدم کی حیثیت رکھتے ہیں…… یہاں تک کہ یہ نہ صرف ہماری زندگی کو خوشگوار بنانے میں محرک ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ بسا اوقات زیست کے کرخت پن، ٹھہراؤ اور یکسانیت کو معدوم کرتے ہوئے ہمیں مسرت کے آستاں پر بھی پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن جب یہ خواب عام صحت مند حدود سے تجاوز کر کے اُن مراحل میں داخل ہو جائیں جہاں خواب بین حقیقی دُنیا سے ذہنی طور پر قطعاً الگ ہو جانے ہی میں اپنی عافیت دیکھے اور دُنیا کے ساتھ قدم ملانے کے بجائے اپنے ہی خوابوں میں منجمد ہو کر رہ جائے تو یہ ایسی خطرناک چیز بن جاتے ہیں جو بالآخر خواب بین کو مسرت کے بجائے غم و اندوہ سے ہم کنار کر دیتی ہے اور زیست کی اٹھکیلیاں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اوپر میں نے خوابوں کی دو اقسام کا ذکر کیا ہے۔ ایک زمرے میں وہ خواب شامل ہیں جو ماضی سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسری قسم اُن خوابوں پر مشتمل ہے جن کی اساس مستقبل پر قائم ہوتی ہے۔ ماضی کے وہ خواب جو کسی خاص خوشگوار لمحے کی یاد کو تازہ کر دیں، ہمارے لیے بے حد مسرت افزا ہوتے ہیں۔ اسی طرح مستقبل سے وابستہ ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کے رنگ محل جب خوابوں کا لبادہ اوڑھ کر ظاہر ہوتے ہیں تو دل فرطِ مسرت سے دھڑک اُٹھتا ہے۔ تاہم مسرت مستقبل یا ماضی کے خوابوں میں نہیں، یہ اس رفیق یا عزیز ترین ہستی کے ساتھ بیٹھ کر اُن لمحات کی یاد میں ہے جو ہم نے کبھی اکٹھے گزارے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب عاشق و محبوب مل بیٹھتے ہیں تو انھیں گزرے ہوئے لمحات کا تذکرہ قندِ مکرر کا مزہ دیتا ہے: اور دو پرانے دوست جب ایک لمبے عرصے کے بعد زندگی کے کسی موڑ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ماضی کی اُن یادوں میں کھو جاتے ہیں جو دونوں کا سرمایۂ حیات ہیں۔ اسی طرح مستقبل کے خوابوں کا مزہ بھی اکثر و بیشتر مل کر خواب دیکھنے میں ہوتا ہے: یہ خواب بھی کسی عزیز دوست یا ہستی کی معیت میں دیکھے جاتے ہیں اور اِن کے دیکھنے سے وہ احساس بیدار ہوتا ہے جو وقت اور جگہ کی قید سے ماورا ہر لحظہ پائیدار رہتا ہے: اور یہاں ہم کمال آہستگی سے اُس مرغزار میں داخل ہو جاتے ہیں جسے "محبت" کے ہمہ گیر لفظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ محبت کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ جب تک یہ جذبہ قائم رہتا ہے، انسان پر چھا جانے والے آلام و افکار تاریک ترین گوشوں میں دُبک جاتے ہیں اور انسان دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس رُوحانی سُرور (bliss) میں تحلیل ہو جاتا ہے جو مسرت کا جوہر ہے۔ عورت اور مرد کی اس کامیاب اور مسرت آفریں محبت کو کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے، یہ سوال الگ بحث کا طالب ہے…… ہاں اتنا صاف ظاہر ہے کہ یہی محبت

جب عورت اور مرد کے تعلقات سے بلند ہو کر وطنیت اور بعد ازاں آفاقیت کا لباس اوڑھ لیتی ہے تو دل کو لازوال مسرت سے مالا مال کر دیتی ہے اور یہاں پہنچ کر بے اختیار ہمیں اس نظریے کی سچائی پر شک گزرنے لگتا ہے جس کی رو سے تمام تر مسرت کو صرف دولت کا رہینِ منت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فی زمانہ لوازمِ زندگی حاصل کرنے کے لیے دولت کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ محض روپے کی فراوانی سے انسان مسرت کی لہروں سے ہم کنار ہو سکتا ہے...... اگر یہ بات ہوتی تو دنیا کے امیر ترین اشخاص زہروف (Zaharoff)، ہنری فورڈ (Henry Ford) اور نظام دکن دنیا کے سب سے زیادہ خوش باش لوگ ہوتے: اور اگر یہ نہیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ مسرت محض دولت ہی کی رفیق و غم گسار نہیں، اسے بعض ایسی چیزوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے جو دل کے ساغر کو مسرت و نشاط سے بھر دیتی ہیں اور جن کا سلسلہ ایک مسکراتے ہوئے پھول سے لے کر محبوبہ کی ادائے دل نواز تک پھیلا ہوا ہے۔

خاتمے سے پہلے میں مسرت کے متعلق مشہور فلسفی جج پی ایم ہبرٹ (P.M.Hubbart) کا ایک Convogation کے موقع پر خطاب قلم بند کر دینا چاہتا ہوں، جس کے خیال کے مطابق:

> اس کلبلاتے ہوئے دور میں جب کہ آلام و افکار کی پیچیدگیوں نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ مسرت حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ جنگ و جدوجہد کرنا پڑتی ہے، چار ایسے گروہ موجود ہیں جو اسے مہیا کرنے کا بیڑا اٹھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک گروہ سائنس دانوں کا ہے لیکن یہ لوگ اپنے مشن میں بری طرح ناکام رہے ہیں: اگر یہ سالہا سال کی محنت کے بعد پنسلین ایسی حیرت انگیز دوا ایجاد کر لیتے ہیں تو اسی دوران میں ان کا کوئی بھائی بند ایٹم بم ایجاد کر کے انسان کے آلام و مصائب میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح ماہرینِ اقتصادیات کا گروہ ہے لیکن یہ حیران کن حقیقت ہے کہ یہ گروہ انسان کو جس قدر مسرت مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے، انسان بتدریج اسی قدر اقتصادی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں گرفتار ہوتے چلا جاتا ہے۔ یہی حال اس تیسرے گروہ کا ہے جس پر سیاست دانوں کا تسلط ہے: اس سلسلے میں زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں کہ لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے اولیں اجلاس سے لے کر یو این او (UNO) کی آخری رسا کشی تک چلے آئیے، آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ گروہ انسان کو مسرت دلانے کا وعدہ تو کرتا ہے لیکن اسے کہاں تک پورا کر سکا ہے! آخری گروہ ان رجعت پسند اور کوتاہ بین مذہب پرستوں کا ہے جو مذہب کو عالم گیر محبت اور مسرت کا محرک تو تصور کرتے ہیں لیکن خود اتنے متعصب ہیں کہ دوسروں کو وہ حقوق دینے پر رضامند ہی نہیں جنھیں اپنے لیے جائز اور ضروری خیال کرتے ہیں۔

یہ خیالات ایک گہرے تفکر اور پختہ شعور کا نچوڑ ہیں اور انھیں ہم اجتماعی زندگی میں مسرت کے سوال کا ایک زیرک اور صحت مند جائزہ ضرور قرار دے سکتے ہیں!

مسرت ـــــ عام زندگی میں

"ایک بات ہے بھابی!"

"کیا؟"...... بھابی نے دھاگا دانتوں سے کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"پنسل بناتے ہوئے ذرا زخم لگ گیا ہے"...... اُس نے انگلی آگے کر دی خون بوند بوند زمین پر ٹپکنے لگا۔

"اوہ......! یہ تو گہرا لگا ہے"...... بھابی گھبرائی۔

لیکن وُہ اطمینان سے ویسے ہی کھڑا رہا۔

بھابی پٹی ڈھونڈ رہی تھی اور اُسے کتنا مزہ آ رہا تھا...... اُس کا جی چاہا کہ عمر بھر اُس کا خون یوں ہی بہتا رہے اور بھابی آہ کاش...... اسی طرح گھبرائی ہوئی پٹی ڈھونڈتی رہے!

("شکست" از کرشن آغا)

اسی کیفیت کو جسے ایک وقت انسان اَبدیت سے ہم کنار دیکھنا چاہتا ہے، قانٹی نیلی نے مسرت کا نام دیا ہے، لیکن حقیقت میں یہ کیفیت نہ تو ابدیت کی حامل ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا سحر اَبدیت کی فضا میں قائم رہ سکتا ہے...... محبوب بچھڑ جاتا ہے، پھول مرجھا جاتے ہیں، شفق گم ہو جاتی ہے، نغمہ تھم جاتا ہے، اور موت کا عفریت ایک شاداں و فرحاں زندگی کو نگل جاتا ہے...... اور یوں وُہ ایک لمحہ جو سمٹ کر انسان کا قیمتی اثاثہ بنا تھا، منتشر ہوتے ہوئے ناپید ہونے لگتا ہے۔ ویسے بھی اس لمحے کی مسرت آفریں کیفیت، وقت کے تھنجالے سے ذرا بے نیاز ہو کر ٹھہرنا پسند کرے تو اس کی شدت میں فوری تغیر نمودار ہونے لگتا ہے حتٰی کہ اس کی سحرکاری معدوم ہوتے ہوتے فنا ہو جاتی ہے اور انسان چونک کر بیدار ہو جاتا ہے۔ فی الواقعہ کسی مسرت بھرے لمحے کی خوبی اُس کی طوالت میں نہیں اُس کے اختصار میں ہے۔

یہاں تھوڑی دیر کے لیے مسرت کی منفی اور مثبت کیفیات کا تجزیہ کر لینا ضروری ہے، تاکہ مسرت کی ماہیت

اور اس کے زندگی پر اطلاق کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ مشہور چینی مصنف لن یو تانگ کے مطابق مسرت' اکثر و بیشتر منفی اجزا سے مرتب ہوتی ہے: یعنی ہماری روز مرہ زندگی میں غم یا مصیبت کے فقدان کا قیمتی لمحہ، مسرت آفریں کیفیات کا حامل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری زندگی افکار و حوادث کے بوجھ تلے اس قدر دبی کچلی رہتی ہے کہ جب کبھی کوئی سہارا مل جاتا ہے' یا یہ بوجھ چند گریزاں لمحوں کے لیے شانوں سے نیچے آ رہتا ہے' تو محسوس ہوتا ہے گویا ہمیں مسرت کا خزینہ مل گیا ہے۔ اس کی ایک مثال اس مشہور مصنف کا قصہ ہے' جس نے غروب آفتاب کے وقت کسی سرسبز ٹیلے پر سے ایک ریل گاڑی کو گزرتے دیکھا تو اسے محسوس ہوا گویا ہزاروں افکار و آلام' ریل کے ڈبوں میں بند اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے روپوش ہو گئے ہیں...... یہ منفی مسرت زندگی کے اس ڈرامے کے ہر ڈراپ سین پر ہمارے پیش نظر ہوتی ہے اور ہم اس کے چند گھونٹ پی کر اپنی تشنہ و درماندہ روحوں کو تازہ دم کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک مثبت مسرت بھی ہے جسے حاصل کرنا یا جس میں ڈوب کر رہ جانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں...... یہ مسرت صرف ان لوگوں کو ارزانی ہوتی ہے جو نہ صرف ایسے موقعوں کے جویا رہتے ہیں (جن کے طفیل وہ اسے محسوس کر سکیں) بلکہ جو خود اپنی سعی سے ایسے موقعوں کو معرضِ وجود میں آنے کی تحریک بھی دیتے ہیں۔ یہاں ہیزلٹ (Hazlm) کے مشہور مضمون Going on a Journey کے یہ الفاظ یاد کیجیے:

> آسمان نیلا اور شفاف ہو۔ زمین پر حدِ نظر تک سبزہ بچھا ہوا ہو۔ ایک پتلی بل کھاتی پگ ڈنڈی افق تک دوڑتے چلی گئی ہو اور مجھے تین گھنٹے کی سیر کے اختتام پر لذیذ کھانا ملنے کی توقع ہو...... ممکن نہیں کہ میں خوشی سے چہکنا نہ شروع کر دوں۔ ایسے لمحوں میں میں ناچتا ہوں' کودتا ہوں اور خوشی سے گانا شروع کر دیتا ہوں۔

مثبت مسرت کے ان لمحات کو ایک اور مصنف نے یوں تحریر کیا ہے:

> جب موسم گرما کی ایک اداس شام کو میں افق پر گہرے سیاہ بادل کو ابھرتے ہوئے دیکھتا ہوں اور مجھے یقین ہوتا ہے کہ برسات کا گرجتا گنگناتا بادل چند ہی لمحوں میں محیط ہو کر برسنے لگے گا تو میں گھر سے نکل کر دور کھیتوں میں چلا جاتا ہوں اور پھر بارش میں بھیگا، کپڑوں کو پانی سے شرابور کیے گھر لوٹتا ہوں...... اس وقت مجھے سچی مسرت کا شدید احساس ہوتا ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا بھی مناسب نہیں کہ مسرت کوئی تلاش ہونے والی یا بیرونی اشیا سے لپک کر انسان کے سراپے پر مسلط ہو جانے والی چیز ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انسان کے اندر

ایک پُراَسرار سی روشنی ہے جو بیرونی اَشیا کو بھی منوّر کر دیتی ہے۔

روشنی، مسرت کا جوہر ہے: اَشیا یا واقعات مسرت کا منبع نہیں۔ ہماری مسرت تو اُس ذہنی کیفیت سے عبارت ہے جو اَشیا کو ایک نئی زندگی اَور اَنوکھا رنگ تفویض کرتی ہے۔ اگر کسی شخص کا دل خوش ہے تو اُسے فضا' ماحول' زندگی اَور آسمان' پہاڑ اَور سمندر' ہر چیز سے مسرت پھوٹتے ہوئے نظر آئے گی: لیکن اِس کے برعکس ایک رنجیدہ دل کو ہر چیز پر تاریکیاں اَور ہر شے میں بھیانک گہرائیاں نظر آتی ہیں۔ سوامی رام تیرتھ کے متعلق مشہور ہے کہ اُن کی قلبی واردات کچھ اِس قسم کی مسرت سے ہم کنار تھی کہ تبسّم اُن کے ہونٹوں سے اُترتا ہی نہیں تھا اَور وہ جس کسی سے بولتے' اُسے محسوس ہوتا کہ مسرت سوامی کے ہر مُوئے بدن سے نکل نکل کر فضا کو بہجت سے لبریز کر رہی ہے۔ روزمرّہ زندگی میں آپ کو کوئی نہ کوئی اَیسا شخص ضرور ملا ہوگا جس کے ہونٹوں پر لرزتا ہُوا تبسّم' اُس کی دلی طمانیت کا غمّاز ہوگا: اُس کے قہقہوں میں جان ہوگی: اُس کی حرکات و سکنات سے بھرپور زندگی مترشح ہو رہی ہوگی: اَور اُس سے مل کر اُس سے باتیں کر کے' یُوں محسوس ہُوا ہوگا گویا کوئی برقی رَو آپ کے سراپے میں سرایت کر گئی ہے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک مسرت کی اہمیت اِس کے حصُول میں نہیں: اُس کی تقسیم میں ہے۔ ایسے لوگوں کے مطابق' دیکھنے کی بات یہ نہیں کہ آپ نے زندگی میں خود کتنی مسرت حاصل کی: اصل بات یہ ہے کہ آپ نے کس قدر مسرت دُوسروں کو مرحمت فرمائی۔ چنانچہ وہ برملا کہتے ہیں کہ ایک خوبصورت نظم' ایک خوبصورت مکان کی بہ نسبت بہت زیادہ اَہم ہے...... اِس لیے کہ خوبصورت مکان محض اپنے مکین یا چند اَفراد کو مسرت بخشتا ہے جبکہ ایک خوبصورت نظم، کروڑوں زخموں پر پھاہا رکھ کر اِجتماعی مسرت میں بے مثال اضافے کا موجب ثابت ہوتی ہے۔

تاہم اِس سے میری مُراد ہرگز یہ نہیں کہ مسرت' چندرما کی طرح' تاریک وادیوں اَور گہری گھاٹیوں کو اَپنی نورانی کرنوں سے' سحر انگیز تابندگی تو عطا کرتی ہے لیکن خود ماحول سے متاثر نہیں ہوتی۔ چاند' وادیوں پر بھی اُسی طرح چمکتا ہے جس طرح کہ صحراؤں پر: لیکن یہ وادیوں کا حُسن ہی تو ہے جو چاند کے حُسن کو دوبالا کر دیتا ہے! نظرِ عمیق اِس بات کی گواہی دے گی کہ ماحول، مسرت کی مختلف کیفیات پر نئے ڈھنگ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اِس کی ایک مثال شہری اَور دیہی زندگی کا موازنہ ہے۔ شہری زندگی کی اِمتیازی خصوصیت ہنگامہ اَور کشمکش ہے: نتیجۃً مسرت کی نوعیت بھی ہنگامی اَور گریز پا ہوتی ہے...... یہاں مسرت زیادہ تر حسّی کیفیات کا مرتّب ہوتی ہے...... دفتر کے دن بھر کے جھمیلوں اَور فریب

ریاکاری اور کبھی کبھی زندگی کے طویل وقفوں کے بعد بچوں کے معصوم قہقہے یا سینما کی متحرک تصاویر' کسی علمی و ادبی مجلس میں شرکت یا محض چند ایسے دوستوں کی صحبت کہ جن کے خیالات و احساسات ایک جیسے ہوں۔ اس کے برعکس دیہات میں سکون اور خاموشی کا دور دورہ ہوتا ہے...... یہاں کائنات' اپنی تمام تر رنگینیوں میں ملبوس اور فطرت' اپنی تمام تر سحر کاریوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے...... یہاں سمندر کی وسعت' کوہساروں کی بلندی' شفق کی رنگینی اور طوفانوں کا خروش ہوتا ہے' اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب طلسمی سی خاموشی' جس کا سحر انگیز تانابانا انسانی احساسات کو اسیر کر لیتا ہے...... اس ماحول میں' انسانی مسرت کی نوعیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے' مسرت کی مثبت کیفیات اُبھرنے لگتی ہیں' اور انسان (بشرطیکہ وہ خوشی حاصل کرنے کے قابل ہو) قدم قدم پر کسی شفق کے روبرو' کسی پہاڑ کے سامنے' کسی وادی میں پہنچ کر' یا محض ایک اُڑتے ہوئے بادل کے ریشمیں آنچل کو دیکھ کر' ایسی مسرت محسوس کرتا ہے جسے بیان کرنا بھی مشکل ہے۔

پس مسرت پر ماحول کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن جب ہم مسرت کو' اس کی منفی اور مثبت کیفیات سے ماورا' ایک مجموعی حیثیت سے جانچتے ہیں تو ہمیں بے اختیار لن یوتانگ کے اس نظریے کا قائل ہونا پڑتا ہے' جس کے مطابق مسرت کا راز کسی خاص ماحول کی نہیں' ہر ماحول کی زندگی سے لطف اندوز ہونے میں ہے...... قطع نظر اس سے کہ یہ زندگی شہری ہے یا دیہی' ہنگامی ہے یا سکوں بیز' امارت کی بلندی پر ہے یا غربت کی گہرائی میں' دوستوں کے قہقہوں میں ہے یا تنہائی کی مسکراہٹ میں......!

اور یہاں اس سنجیدہ بحث کے درمیان اگر زندگی کے چند بظاہر غیر اہم کرداروں کا تذکرہ بھی قابلِ قبول ہو تو میں اپنے گاؤں کے دو ایسے اشخاص کا ذکر ضرور کروں گا جنھیں حیات سے شدید وابستگی نے دو انوکھے نظریوں کا خالق بنا دیا ہے...... ان میں سے ایک کا نام چترت رام ہے اور یہ اچھوت ہے' اور دوسرے کا نام دلاور خاں ہے اور یہ مسلمان ہے...... چترت رام جس وقت یہاں آیا' اس کی عمر پندرہ ۱۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ یکہ و تنہا تھا اور آج بھی اکیلا ہے' اس وقت بھی اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور آج بھی وہ تہی دامن ہے' لیکن اس کی زندگی ایک انوکھی مسرت سے ہم کنار ضرور ہے۔ چترت رام پچھلے چالیس برس سے گدھے کی بلاناغہ سواری کرتا رہا ہے اور یہی سواری اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ گدھے کے گلے میں گھنگرو ڈالے' جب وہ اس پر سوار ہو کر سیر کو نکلتا ہے تو فرطِ مسرت سے اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے مارے خوشی کے چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔

ویسے بھی اُس کی زندگی پر "بچپن" مسلط ہے اور وہ اپنی مختصر اور محدود دُنیا میں بچوں کی سی مسرت حاصل کرتا ہے (Blessed are the idiots, for they are the happiest people on earth - Loatse) ......ایک نیا گدھا، چند گھنگرو، ریل گاڑی کا سفر اور چڑیا گھر کی سیر...... یہی اُس کے خواب ہیں اور اِن خوابوں کی تکمیل ہی اُس کی زندگی کا سب سے نمایاں مقصد ہے!

اِس کے برعکس دِلاور خاں ایک جہاں دیدہ شخص ہے...... اِتنا جہاں دیدہ کہ وہ کوشش کرتا ہے، دُوسرے اُسے احمق ہی خیال کریں۔ دِلاور کی مسرت کا راز اُس کے فلسفۂ حیات میں ہے جو میری رائے میں لن یوتانگ کے فلسفۂ حیات سے بہت قریبی مماثلت رکھتا ہے مگر اپنی شدید اِنفرادیت کی بنا پر اُس سے انوکھا بھی ہے۔ دِلاور کوّے سے لے کر مُرغ تک ہر چیز کو نہایت رغبت سے کھاتا ہے...... اُس کا قول ہے کہ پَر سیاہ ہوں یا سفید، اُن کے نیچے گوشت کی رنگت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ شخص ہر چیز سے ایک پُراسرار سمجھوتا کرنے کا عادی ہے اور برملا کہہ اُٹھتا ہے: میں مانتا ہوں کہ "الف" سچا ہے لیکن "ب" بھی جھوٹا نہیں...... اِنسان کی پیدائش پر وہ خوش ہوتا ہے اور اُس کی موت پر قہقہے لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اُس کے پاس سینکڑوں روپے ہوں، تو بھی، اور اُس کی جیب یکسر خالی ہو، تو بھی اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ یکساں طور پر جاذبِ نگاہ رہتی ہے...... یہی قناعت اُس کے کردار کا مایہ الامتیاز ہے اور اِسی کے طفیل اُس کی مسرت پائیدار عناصر کی حامل ہے!

زندگی سے متعلق اِن دونوں نظریوں کو یکجا کر دیجیے یعنی ایک کی معصومیت کو دُوسرے کی بے نیازی کے ساتھ مِلا دیجیے، آپ کو لن یوتانگ کے اس نظریۂ حیات کا خاکہ نظر آنے لگے گا جس کے مطابق مسرت کا راز زندگی کو سنجیدہ اہمیت دینے میں نہیں بلکہ روز مرہ زندگی سے لُطف اندوز ہونے میں ہے۔

اَب اگر غور کریں تو روز مرہ زندگی سے لُطف اندوز ہونے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اِنسان اِس زندگی کو حقیقی (Real) تصور کرے۔ مسلمانوں کے دُنیاوی طور پر بہت زیادہ ترقی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے کبھی اِس زندگی کو پُوری اہمیت نہ دی، وہ عقبیٰ کے تصور ہی کو اہم سمجھتے رہے اور حیات بعد موت کو حقیقی اور اونچی کیفیات کی حامل خیال کرتے رہے۔ یہی حال بُدھ مت کے پیرووں کا ہوا...... اُنھوں نے تو اِس زندگی کے تمام تر لوازم سے قطعی طور پر منہ موڑ لیا: چنانچہ اُن کا مذہب ایک نمایاں نفی (The Great Negation) کا مظہر ہو گیا اور وہ زندگی کے ہنگاموں کو تیاگ کر تاریک گپھاؤں، راہب خانوں اور پہاڑوں اور جنگلوں کی تنہائیوں میں دبک کر رہ گئے اور اُنھوں نے اپنی تمام تر

توجّہ کو نِروان پر مرکوز کرلیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وُہ اَپنے اِس نظریۂ حیات کی بدولت نیچر کے زیادہ قریب آ گئے اور انھیں قدرتی مناظر اور کائنات کی اَندھی قوتوں سے براہِ راست متکلّم ہونے اور یوں ایک انوکھی مسرّت حاصل کرنے کے بڑے بڑے موقعے بھی مل گئے؛ لیکن آخرش یہ ایک طرح کا فرار ہی تھا۔ وُہ دراصل "زندگی" سے بھاگ گئے تھے اور غم و آلام کو زبردستی بھلا کر "سکون" حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے (اگرچہ یہ اَمر بحث طلب ہے کہ یہ سکون دائمی کیفیات کا حامل تھا بھی کہ نہیں)۔ اُن کے مقابلے میں دیکھیے کنفیوشزم (Confucianism) تھا جس کے مطابق زندگی کا مقصد زندگی ہی سے لُطف اَندوز ہونے میں تھا اور جو فرار کی بہ نسبت زندگی ہی سے ہم کنار ہونے کو زیادہ اَہمیت تفویض کر رہا تھا...... یہاں بھی نیچر کا وجود تھا بلکہ بہت بڑا وجود تھا جس سے محظوظ ہونا مشروط تھا لیکن زندگی سے فرار کو تحریک نہیں دی گئی تھی۔ اِس نظریے کے مطابق زندگی خاموشی اور ہنگامے، شہر اور دیہات، آنسوؤں اور قہقہوں کا ایک دلکش اِمتزاج تھی اور اِس کے مد و جزر سے مسرّت حاصل کرنا انسان کا سب سے بڑا مقصد تھا۔

چنانچہ لن یوتانگ نے اپنے نظریۂ حیات کو اِسی فلسفے پر اُستوار کرتے ہوئے اِس بات پر زور دیا ہے کہ مسرّت حاصل کرنے کے لیے روز مرہ زندگی سے لُطف اَندوز ہونا ضروری ہے...... زندگی جو امیر اور غریب، چور اور سادھو، بیاہ اور موت، پیدائش اور بیماری اور طوفان، زلزلے، بارش اور شفق...... اِن سب کے خوشگوار اِمتزاج سے عبارت ہے۔ اِسی زندگی میں مسرّت کا خزینہ پنہاں ہے۔ صرف غائر نظری کی ضرورت ہے اور ہم بڑی آسانی سے اِس کی رنگینیوں اور رعنائیوں اور اِس کے خوشگوار مد و جزر سے مسرّت کی دولت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور چونکہ اِس زندگی کا سب سے بڑا مظاہرہ ایک اوسط درجے کے "گھر" میں ہوتا ہے، اِس لیے (لن یوتانگ کے بقول) گھر ہی مسرّت کا مرکز ہے اور گھر کی پُرسکون فضا ہی مسرّت کی سب سے بڑی معاون ہے!

اب اگر ہم اِس نکتے پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا اور روز مرہ کا معمول بھی اِس بات کی گواہی دے گا کہ گھر کی چار دیواری سے باہر تو انسان پر سنجیدگی اور ڈسپلن کے موٹے موٹے پردے مسلط رہتے ہیں لیکن جونہی وُہ گھر (ایک اوسط درجے کے پُرسکون گھر) میں داخل ہوتا ہے، یہ تمام باتیں یکسر ڈھل جاتی ہیں اور وُہ محبت، ہمدردی، سکون اور آرام کی فضا کو خود سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ یہاں نہ تو اُسے دقیق سیاسی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنا ہوتا ہے اور نہ ہی کسی منجمد معاشرت کے مخصوص آداب اور کسی دفتری فضا کے قواعد و ضوابط اُس کے لیے کوئی اَہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں وُہ آرام دہ کپڑوں میں ملبوس، قطعی آزادی

اور اطمینان سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اس کی بیوی کی خوش آمدید کہتی ہوئی مسکراہٹ، پیار اور ہمدردی اور بچوں کے معصوم قہقہے اور اُس کی آمد پر دلی خوشی کا مظاہرہ...... یہ تمام چیزیں اُسے سنگلاخ حقائق اور تھکا دینے والے افکار و آلام کی دُنیا سے بلند کر کے ایک حسین اور مسرت آفریں فضا میں لا کھڑا کرتی ہیں اور وہ زندگی کا مصنوعی تنگ جامہ اُتار کر خلوص کا ڈھیلا ڈھالا لباس زیبِ تن کر لیتا ہے۔ مگر اِس مسرت کا تمام تر دار و مدار اس بات پر ہے کہ عورت اور مرد کی زندگی پائیدار محبت پر اُستوار ہو ورنہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ایک تاریک سی افسردگی کا پیدا ہونا اور اُن کے دلوں کو یوں راکھ کر دینا کہ پھر اس میں سے مسکراہٹ کی چنگاری تک نہ مل سکے کوئی غیر اَغلب بات نہیں۔ البتہ وہ لوگ جنھیں اس بات کا علم ہے کہ زندگی کی مسرت گھر کے سُکون کی رہینِ منت ہے اور یہ کہ گھر کا سُکون ایک دُوسرے کے مزاج کے مدّ و جزر کا قریب سے جائزہ لینے اور وقت کے مطابق دُرست رویہ اختیار کرنے میں ہے، اچھا ماحول پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ویسے ازدواجی زندگی کی اُستواری کے لیے مرد کی تحمل مزاجی خاص طور پر نہایت ضروری ہوتی ہے کیونکہ عورت کے کردار اور مزاج میں طبعاً مدّ و جزر کے اِمکانات زیادہ ہوتے ہیں اور وہ مرد کی بہ نسبت بہت جلد جذبات کا سہارا لے لیتی ہے۔ ایک مصنف نے عورت کے مزاج کو سمندر سے تشبیہ دی ہے...... ایک ایسا سمندر کہ جس میں کبھی طوفان آ جاتا ہے اور کبھی سکون چھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> مرد کی دانش مندی اسی بات میں ہے کہ وہ خود کو ایک ملاح کے طریق پر چلنا سکھائے تاکہ جب طوفان اُٹھے تو وہ اپنی کشتی کے بادبان گرا دے، خاموش ہو جائے: اِنتظار کرے کہ طوفان گزر جائے اور موافق ہوا اس کی کشتی کو صحیح سمت میں کھینا شروع کر دے!

لیکن اِس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مرد خود کو صرف عورت کی سوسائٹی اور گھر کی فضا ہی میں خوش رکھ سکتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں تلواروں کی جھنکار، توپوں کی گرج، پہاڑوں کی بلندی اور مقابلے کی فضا میں مسرت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ تاہم یہ لوگ بھی زندگی کے سارے لمحات ایک ہی فضا میں بسر نہیں کر سکتے...... بلاشبہ کسی شام اپنے گھر لوٹتے ہیں، لباس تبدیل کرتے ہیں اور خود کو اپنی بیوی کے ساحرانہ حُسن کے حوالے کر دیتے ہیں...... اب عورت کا راج ہے، عورت کی دُنیا ہے...... یہاں پیار ہے، جذبات ہیں، ہمدردی اور مسرت ہے!!

maablib.org

مُسرّت اُور محبّت

اِنسان کے جسمانی اور روحانی اِرتقا کے مدارج کا غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ حیوان کے برعکس اِنسان کو نہ صرف نسبتاً لمبے اور غیر محفوظ بچپن سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ اُسے اپنی جسمانی اور ذہنی ترقی کے مابین توازن کی کمی سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ وہ یوں کہ اِنسان ذہنی طور پر تو جلد ہی اپنے ماحول کا اِدراک کر لیتا ہے لیکن جسمانی تکمیل کی آہستہ روی کے باعث اپنے ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کی تاب دیر تک نہیں لا سکتا۔ چنانچہ ایک نمایاں احساسِ کمتری جنم لیتا ہے جو بتدریج اُس کے احساسِ تنہائی کا محرک بنتے چلا جاتا ہے۔ اِنسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ زندگی کے آغاز میں جب اِنسان کو ایسی ہی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑا اور ایک احساسِ کم مائیگی و تنہائی اُس پر مسلط ہو گیا تو وہ از خود اُن قوانین اور حربوں کی طرف راغب ہوتے چلا گیا جن کے طفیل وہ اِس غیر محفوظ صورتِ حال سے پیدا شدہ کمتری اور تنہائی کے احساسات کا مقابلہ کر سکتا...... یہ ضرورت اُس کے طبعی رجحانات کا جامہ اوڑھ کر قبیلہ پسندی، قوتِ اِظہار اور محبت کے احساسات کی صورت میں نمودار ہوئی جن کی مدد سے اِنسان، تہذیب و تمدن کی طویل شاہراہ پر گام زن ہوا۔

مگر احساسِ تنہائی کا جو مرض ہزارہا سال قبل محض حیاتیاتی اثرات کے تحت نمودار ہوا تھا آج اِنسانی مسرت کا سب سے بڑا دشمن بن چکا ہے: اگرچہ اسکا مقابلہ کرنے کیلیے اِنسان کے پاس مجلس، آرٹ اور مذہب کے علاوہ بھی مصروفیت کے سینکڑوں حربے موجود ہیں لیکن شاید محبت ہی وہ واحد کیفیت ہے جس کی مدد سے اُس نے اِس مرض پر زیادہ سے زیادہ فتح حاصل کی ہے...... اور اِس فتح کا انداز بھی نرالا ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ احساسِ تنہائی جو حیاتِ انسانی کے اوّلیں ادوار کی یادگار ہے، اب انسانی ذہن کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ چنانچہ آج انسان، انبوہ میں رہتے ہوئے بھی، خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ موجودہ زندگی کی مصروفیات (سیر و تفریح، رقص و موسیقی، سیاست اور لیڈر شپ اور ان گنت دوسرے مسائل) کے باوجود اُسے اپنی زندگی کے کھوکھلے پن کا شدید احساس ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک لمحاتی کیف کے سوائے کچھ بھی مہیا نہیں کرتیں، اور اُن سنگین دروازوں اور سنگلاخ دیواروں والے زندان کے تو قریب بھی نہیں پھٹکتیں جن کے اندر اس کی رُوح ایک خانماں برباد شہزادے کی طرح قید ہے...... یہ قفس اس کے ایغو (محدود خودی) کا قفس ہے جس کی تعمیر میں اس کے ہزار ہا برس کے دشمن، احساسِ تنہائی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ بظاہر تو وہ سوسائٹی کا فرد ہے...... کلبوں، ریستورانوں اور سیر گاہوں میں گھومتا ہے، آرٹ اور موسیقی اور سیاست اور جنگ میں حصہ لیتا ہے، لیکن بنیادی طور پر ایغو کی چار دیواری میں اس بری طرح سے قید ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود بھی اپنی رُوح کو کسی دوسری رُوح سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا...... ہزار کوشش پر بھی اپنے قفس کے اُن زنگ آلود دروازوں کو نہیں کھول سکتا جن سے گزر کر مسرت کی لپٹیں اس کے نہاں خانۂ دل کو معطر کر سکیں۔ ہاں، ایک چیز اُسے اس قید سے رہائی دلاتی ہے اور اس کے ایغو کی منجمد دیواروں کو گرا کر، اُسے کسی دوسری رُوح سے اس طور سے ہم آہنگ کر دیتی ہے کہ غیریت کے سارے مظاہر پاش پاش ہو جاتے ہیں...... یہ ہے انسانی محبت...... وہ لطیف کیفیت جس کے سحر میں اسیر ہو کر، دو دل ایک ہی تال پر دھڑکتے ہیں...... وہ کیفیت جو زماں و مکاں کی حدود سے ماورا ہے اور جس کے طفیل ایک انسان، دوسرے انسان کو اپنے دل میں جگہ دے کر، اور اس کے سامنے اپنے دل کی ساری کیفیات کو بے نقاب کر کے، صدیوں پرانے احساسِ تنہائی سے چھٹکارا پاتا اور یوں اپنی حیات کی محدود تنہائی کو شادیانے بجاتی زندگی سے ہم آہنگ کر لیتا ہے...... شاید یہی وجہ ہے کہ کسی محبوب ہستی کا قرب، اشیا میں نئے معانی پیدا کر دیتا ہے، کوہساروں اور وادیوں کی دل نوازی بڑھ جاتی ہے، رقص اور موسیقی کی لہروں میں ایک نیا تموج پیدا ہو جاتا ہے، اور آسماں کی نیل گوں چادر کے نیچے ہر شے ایک لطیف کیفیت میں بسے ہوئے نظر آنے لگتی ہے۔

لیکن محبوب ہستی کا یہ قرب (اگرچہ بے پایاں مسرت کا موجب ہے) کچھ عرصہ گزر جانے پر اور ماحول کی یک رنگی کے طفیل اپنی شدت کھونے لگتا ہے۔ یہ چیز محبت کے خوش نما پودے کو آہستہ آہستہ گھن کی طرح کھوکھلا کرتے چلے جاتی ہے حتیٰ کہ ایک صبح انسان پر یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ اس کے دل میں

اپنے محبوب ساتھی کے لیے وہ محبت ہی باقی نہیں رہی جو آغاز میں تھی۔ محبت کے سفر کا یہ موڑ بڑا خطرناک ہوتا ہے اور دیکھا جائے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ دوا کی پہلی خوراک کی طرح محبت، شروع میں تو کافی اثر انگیز تھی مگر مسلسل قرب سے انسان اس کا اتنا عادی ہو گیا کہ آخرش ایک روز یہ قطعاً بے اثر ہو کر رہ گئی۔

اس مسئلے پر مزید غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کسی ہستی کو اپنانے کی شدید خواہش، جسے ہم پورا کرنا چاہتے تھے، بنیادی طور پر وہی احساسِ تنہائی تھا جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں اور اسی احساسِ تنہائی سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان ایسی ہستی کی طرف راغب ہوا جس کے ساتھ وہ روحانی اور جسمانی طور پر ایک ہو سکتا۔ محبت کا پہلا ملاپ تو بڑا مسرت افزا تھا، لیکن خواہش کی تکمیل، خواہش کی موت ثابت ہوئی اور آہستہ آہستہ محبوب ہستی اس کشش سے محروم ہوتے چلے گئی جس نے محبت کے اولیں شعلوں کو تحریک دی تھی۔

دراصل محبت کی یہ اذیت ناک موت، جس سے مسرت کے سوتے بھی خشک ہو جائیں، ہماری اپنی غلط ذہنی کروٹ کا نتیجہ ہے۔ "حصول" سے پہلے محبت کے ایام بالعموم اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ محبت میں تھکن پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ازدواجی زندگی میں شب و روز ایک جگہ رہ کر اور ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب کا درجہ اختیار کر لینے کے بعد ہی ایسا مقام آتا ہے کہ اکتاہٹ کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ ازدواجی زندگی کی مسرت کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورت میں اتنا گہرا اختلاف پیدا نہ ہو جائے کہ دونوں ایک چھت کے نیچے سونے کی تمنا ہی چھوڑ دیں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں کے خیالات، میلانات اور زندگی کے متعلق نظریات میں وہ یک رنگی بھی نہ آنے پائے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ایک کھلی کتاب کا درجہ اختیار کر جائیں اور ایک کے لیے دوسرے میں کوئی نئی بات ہی باقی نہ رہے۔ پس وہ تمام لوگ جو یہ آرزو کرتے ہیں کہ ان کی محبوبہ ان کی اپنی نمایاں خصوصیات کا مکمل نمونہ ہو، محض خود پرستی کا شکار ہوتے ہیں، لہٰذا زندگی کی مسرتوں سے بالعموم محروم رہ جاتے ہیں۔ دراصل عورت اور مرد کے مزاج، کردار اور نظریات میں ہلکا ہلکا اختلاف انھیں ایک دوسرے کے لیے پرکشش بنانے میں محرک ثابت ہوتا ہے اور چونکہ اختلاف اور بُعد (چاہے وہ کسی قسم کا ہو)، انسان میں احساسِ تنہائی کو ابھارتا ہے اور ازبسکہ احساسِ تنہائی کا ردِعمل دوسری ہستی کو اپنانے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، لہٰذا عورت اور مرد میں یہ خفیف سا بُعد ان کی محبت کی شدت کو کبھی انحطاط پذیر نہیں ہونے دیتا اور وہ مسرت کی

خوشبوؤں سے ہمیشہ لطف اندوز رہتے ہیں۔

عورت اور مرد کا یہ بُعد ایک لحاظ سے ضروری بھی ہے..... وہ اس طرح کہ یہ بُعد نہ ہوتا تو اپنانے کی خواہش ہی کیسے پیدا ہوتی! اگر ہم اس مسئلے کو حیاتیاتی طور پر (Biolngically) حل کرنا چاہیں تو ہمیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ زندگی کے آغاز میں مرد اور عورت ایک ہی جسم میں موجود تھے۔ پھر جدا ہوئے اور تب سے شب و روز اس خلیج کو پُر کرنے اور ایک دوسرے سے مل جانے کی تگ و دو میں بُری طرح مصروف ہیں۔

مندرجہ بالا "بائی سیکشوئل تھیوری آف لائف" کے جواز میں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ آج بھی مرد کے جسم میں عورت کے جسم کے بعض نشانات موجود ہیں' بعینہٖ جس طرح عورت کا جسم مرد کے جسم سے بعض اُمور میں مطابقت رکھتا ہے..... نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ خیالات' احساسات اور جذبات کی دُنیا میں بھی یہ ہم آہنگی موجود ہے۔ اگرچہ مرد کے تمام تر رُجحانات کو فکر (Thought) کا سہارا نصیب ہے اور عورت کے رُجحانات کو احساس (Feeling) کا' پھر بھی یہ امتیازی نشان اس قدر غیر واضح ہے اور ان دونوں کی حُدود اس قدر اُلجھی ہوئی ہیں کہ مرد میں نسوانیت اور عورت میں مردانہ پن کے نمایاں رُجحانات سرایت کر گئے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال تقویت اختیار کر چکا ہے کہ عورت' مرد سے ایک "نمایاں برتری" کی طالب ہے؛ لہٰذا وہ پسند کرتی ہے کہ مرد میں جسمانی طاقت اور ذہنی برتری کا لازوال سرمایہ موجود ہو اور وہ (یعنی عورت) اُس کے ہاتھوں میں بے بس ہو جائے۔ اسی طرح کا یہ خیال بھی بڑا عام ہے کہ مرد' عورت سے "نسوانیت" کا طالب ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ عورت "سپاٹ اور ٹھوس" ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رُجحانات کا بالعموم عالم یہی ہے۔ لیکن گہری نظر سے دیکھیں تو تصویر کا دوسرا رُخ بھی سامنے آ جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ عورت، مرد میں کسی نہ کسی حد تک نسوانیت اور لچک کی بھی طالب ہوتی ہے اور مرد، عورت میں ایک حد تک سختی اور برداشت کا بھی جویا ہوتا ہے۔ اس سے عورت اور مرد کی متضاد خصوصیات کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع ملتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ عورت، مرد میں زیادہ زنانہ پن کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے اور مرد، عورت کی زیادہ "جرأت" کو اچھا نہیں سمجھتا۔ حیرت ہے کہ فرد کے لیے وہی خصوصیت جس کا وہ خود مظہر ہے' دوسری صنف میں زیادتی اختیار کرنے پر ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے! بہرحال اس بات سے انکار مشکل ہے کہ پُر مسرت

ازدواجی زندگی اور محبت کے لیے مرد میں ایک حد تک نسوانیت کا ہونا ضروری ہے: بعینہٖ جس طرح عورت میں مردانہ پن کے بعض عناصر کا وجود لازمی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں مرد احساسات کا سہارا لے کر گھر کے امور مثلاً بچے کی نگہداشت، عورت سے پیار وغیرہ میں نمایاں دلچسپی لیتا ہے، وہاں عورت اپنے پُراسرار اور مبہم احساسات سے بلند ہو کر مرد کے ٹھوس معاملات میں دلچسپی لینے لگتی ہے اور یوں ازدواجی زندگی کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا، خیالات اور احساسات میں نمایاں فرق ہے یعنی مرد کی دنیا بنیادی طور پر فکر کی دنیا ہے...... تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے کہ مرد نے فی الواقع سائنس، فلسفے، طب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو حیرت انگیز ترقی کی، وہ اس کے تخیل کے غیر مبہم سلسلے کی رہینِ منت تھی؛ علاوہ ازیں یہ اس کا تخیل ہی تھا جس کے طفیل الجھی ہوئی زندگی نے توازن اور اعتدال کی سلجھی ہوئی صورت اختیار کی اور انسان ارتقا کی طرف تیزی سے گامزن ہو گیا۔ اس کے برعکس عورت کی دنیا بنیادی طور پر احساسات و جذبات کی دنیا تھی، اسی لیے اس کی زندگی از سر تا پا بدلتے ہوئے رجحانات، مبہم کیفیات اور استقلال کے فقدان کی غماز رہی۔ اس سلسلے میں عورت کو چاند سے تشبیہ دی جا سکتی ہے...... یہ اس لیے کہ فی الواقع عورت کے کردار میں چاند کی سی پیہم تبدیلی موجود ہے اور کردار کی اسی سیماب وار کیفیت کے باعث وہ سامنے آنے کے بجائے پس منظر میں رہی ہے۔

ویسے بنیادی طور پر عورت فطرت کی صحیح ترجمان ہے، تسلسل کی محرک ہے اور تخلیق کرتی ہے...... اسی لیے کائناتی مسائل میں اسے زیادہ وقعت حاصل ہے۔ مرد تو محض کٹھ پتلی ہے جو اپنے فرض کی ادائی کے بعد فطرت کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے۔ حیاتیاتی طور پر بھی دیکھا گیا ہے کہ مادہ کی زندگی نہ صرف نر سے طویل تھی بلکہ اتصال کے بعد بیشتر صورتوں میں نر فی الفور ختم ہو گیا جبکہ مادہ تخلیق کو مکمل کرنے کے لیے زیادہ عرصے تک زندہ رہی۔

اب چونکہ مرد کے بغیر تخلیق ممکن نہیں تھی، اس لیے فطرت نے عورت کو شروع ہی میں وہ سب کچھ ودیعت کر دیا جس کے بغیر وہ مرد کو اپنے حلقۂ دام میں جکڑنے سے معذور تھی۔ چنانچہ اس کی نزاکت، شعریت، حسن اور ادا اور اس کے گرد شعر و نغمہ سے بنی پُراسرار، خواب انگیز فضا نے مرد کو اپنے طلسم ہوش رُبا میں اسیر کر لیا اور اس کی تمام تر جسمانی اور روحانی قوتوں کو "تخلیقِ حیات" کے مقصد کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بنانے کی سعی کی مگر اس کا ردِعمل بھی ضروری تھا، چنانچہ مرد، عورت سے فرار کی طرف مائل ہو گیا۔ یہ چیز نہ صرف

اوّلیں قبائل میں ملتی ہے جہاں عورت کو ممنوع (Taboo) قرار دے دیا جاتا تھا بلکہ مذہب کی بیشتر روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہیں سے اخلاق کے اس پہلو کی ابتدا ہوئی جس کے مطابق جنسی میلانات کو گناہِ عظیم تصور کیا گیا اور عورت کے ساتھ ملاپ کو جرم سمجھا گیا (واضح رہے کہ آدم ایسا جلیل القدر پیغمبر بھی اسی بنا پر فردوس کی پاکیزہ فضا سے باہر نکلنے پر مجبور ہوا تھا)۔ دراصل اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مرد شروع ہی سے جسم پر روح کی فتح کا قائل تھا اور عورت چونکہ بنیادی طور پر جسم اور اس کے لوازم اور جسم کی تخلیق کی ضامن تھی' لہٰذا اُسے گناہ کی علم بردار تصور کیا گیا۔ جادو کے زمانے سے اب تک ڈائن کا جو تصور ہم تک پہنچا ہے' وہ بھی نمایاں طور پر ایک ایسی عورت کا تصور ہے جو جنسی خواہش کے دور سے گزر رہی ہوتی ہے اور جس سے فرار اختیار کرنے کی واضح طور پر ترغیب دی گئی ہے' یعنی یہ کہ جب ڈائن آواز دے تو ٹھہرنا اور مڑ کر دیکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ دراصل خطرہ یوں پیدا ہوا کہ مرد نے اگر ایسی عورت کو دیکھ لیا تو عورت کی جنسی کشش' مرد کے تمام ارادوں کو شل کر دے گی اور وہ اس کے سحر میں اسیر ہو کر اپنے اعلیٰ عزائم کو تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہ جائے گا۔ عورت سے یہ فرار آج بھی ہماری سوسائٹی میں موجود ہے۔ نظم جو انسان کی لاشعوری خواہشات کی ترجمان ہے' اس حقیقت کو بدرجہ اتم نمایاں کرتی ہے اور عورت کے "زندان" سے محفوظ رہنے اور اس کی دنیا سے کنارہ کش ہونے کی ایک واضح خواہش اس سے جھلکتے ہوئے نظر آتی ہے۔ ویسے عام ازدواجی زندگی میں بھی دیکھا گیا ہے کہ بے لوث محبت کے باوجود کچھ عرصے کے بعد مرد' عورت کے ریشمیں دام سے کم از کم لمحاتی طور پر فرار حاصل کرنے اور کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لینے کی زبردست تحریک سے ضرور دوچار ہوتا ہے۔ دوسری طرف عورت کا مسلک یہ رہا ہے کہ وہ مرد کو اپنے تسلط سے باہر نہیں جانے دیتی۔ عورت کا قانون بنیادی طور پر مجتمع کرنے (To bind together) کا قانون ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ مرد اس کے بازوؤں کے مخملیں حلقے سے باہر نکل جائے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر مرد، عورت کی مخملیں بانہوں سے آزاد ہونے کی خواہش نہ کرتا تو آج اس کے خیال کا ارتقا اور اس کی تہذیب کی عمارت فطرت کی اوّلیں حیوانی سطح کے نیچے ہی دبی رہتی...... وہ اس لیے کہ عورت جذبات' احساسات اور طبعی رجحانات کی ترجمان ہے اور یہ چیزیں فطرت کی حیوانی صورت کے زیادہ قریب ہیں۔

تاہم عام ازدواجی زندگی میں یہ بات بھی گہری توجہ کے لائق ہے کہ جہاں عورت ایک خاص حد تک مرد کو اپنے ریشمیں دام میں جکڑ کر اس سے فطرت کے مقاصد کی تکمیل میں مدد لیتی ہے' وہاں وہ اس

مقصد کی تکمیل کے بعد مرد سے ایک لمحاتی گریز بھی ضرور اختیار کر لیتی ہے۔

چنانچہ ازدواجی زندگی کی مسرت کی قاتل دو چیزیں ہیں...... مرد کا لمحاتی فرار اور عورت کا لمحاتی گریز کہ ان کی غلط تفہیم سے کتنے ہی لوگوں کی زندگیاں بربادی اور بے بسی کی تصویر بن گئیں۔ اگر مرد، عورت کے کردار کے متعلق پوری واقفیت رکھتے ہوئے یہ سمجھ لے کہ اُس کا لمحاتی گریز ایک حیاتیاتی مسئلہ ہے جس سے مفر نہیں اور عورت، مرد کے فرار کو اُس کے فطری ردِ عمل کا عکس سمجھ کر اِغماض و درگزر سے کام لے تو کوئی وجہ نہیں کہ بربادی کے قعرِ عمیق میں گرتی ہوئی زندگیاں آخری تنکے کا سہارا لے کر ہی صحیح و سلامت باہر نہ نکل آئیں اور زندگی کی مسرتیں انحطاط پذیر ہونے کے بجائے فزوں تر نہ ہوتے چلی جائیں!

جیسا کہ ہم جانتے ہیں محبت کے دو مدارج ہیں...... تلاش اور حصول اور یہ دونوں مدارج انسان کو مسرت کے کیف زا لمحات بہم پہنچانے میں پیش پیش ہیں۔ محبوب کو حاصل کرنے کی تگ و دو اگرچہ مختصر ہوتی ہے اور بیشتر اوقات آنسوؤں اور سسکیوں کے تسلسل میں جاری رہتی ہے تاہم اسے اُمیدوں اور آرزوؤں کی پریاں سنوارتی ہیں اور یہ ننھے ننھے خطرات سے بھی نبرد آزما ہوتی ہے اس لیے مجموعی طور پر مسرت بخش ثابت ہوتی ہے۔

یہاں میراجی کی وہ مریضانہ محبت بھی یاد رہے جو حصول ہی سے بے نیاز تھی: یہ اور بات کہ ایسی محبت میں بھی لذت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ میراجی نے خود کہا ہے:

ہاں جیت میں کوئی نہیں نشہ، یہ بات ہے جیت سے دوری کی
جو راہ رسیلی چلتا ہوں اُس راہ پہ چلتا جانے دے!

دوسری طرف محبت کا آخری مقام جسے "حصول" کہنا چاہیے سنگِ بنیاد کا درجہ رکھتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ آخرِ کار محبت اسی سنگِ بنیاد پر استوار ہوتی ہے تو یہ کوئی مبالغہ آمیز بات نہیں ہوگی؛ لیکن حیرت زا بات یہ ہے کہ مرد نے حصول کو محض "جنسی ملاپ" سمجھا ہے اور اس بات کو قطعاً فراموش کر دیا ہے کہ جنسی ملاپ، روحانی ملاپ کے بغیر تسکین بہم نہیں پہنچاتا اور بیشتر اوقات زندگی کو عام انسانی مسرت سے بھی محروم کر دیتا ہے... دراصل مرد کا یہ نظری رُجحان کہ عورت کے جسم سے لذت کا حصول اُس کا "حق" ہے، اُس کی "فتح" کی علامت بن جاتا ہے کیونکہ فی الواقعہ محبت میں حق یا دباؤ کو قطعاً وقعت حاصل نہیں۔ یہاں اس بات میں کوئی فائدہ اور روحانی سرور نہیں کہ آپ نے کیا کچھ چُرایا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ نے کیا تحفہ قبول کیا اور اگر واقعی آپ کو عورت سے محبت تحفۃً ملی ہے تو یقیناً آپ بڑے ہی

خوش قسمت انسان ہیں۔ دُوسرے وُہ لوگ مسرت سے محروم رہتے ہیں جو اس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ صنفِ مخالف سے محض لذّت کا حصُول ایک غلط نظریہ ہے اَور یہ کہ اِس کے برعکس صنفِ مخالف کو مسرت بہم پہنچانا ہی صحت مندی کا نشان ہے۔ اَب اگر دونوں فریق اِس ناقابلِ فراموش اُصول کو مدِّنظر رکھیں اَور خود غرضی اَور ذاتی تسکین کے رُجحانات کو ثانوی حیثیت دے دیں تو یقیناً جسمانی اَور رُوحانی سُرور کے لازوال لمحے اُن کے لیے متاعِ بے بہا بن سکتے ہیں۔

محبت میں جسمانی اَور رُوحانی ملاپ کا یہ پہلو اِس قدر اَہم ہے کہ اِس سے متعلق چند مزید سطور کا اِضافہ یقیناً قابلِ قبول ہوگا۔ چین میں زمین کو مؤنث اَور آسمان کو مذکر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ چینیوں کے مطابق عورت، وُہ تاریک زمین ہے جو ہر شے کو جسم عطا کرتی ہے اَور مرد، وُہ آفتاب ہے جو اِس تخلیق میں مدد بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقعہ مرد اَور عورت کا ملاپ' آسمان اَور زمین' رُوح اَور جسم' تخیل اَور احساس کا ملاپ ہے۔ اِس ملاپ میں مرد رَوشنی کی طرف پشت کر کے خود کو تاریکی میں مدغم کر دیتا ہے اَور عورت اُس تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے، آسمانی رفعتوں کی طرف پرواز کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ مرد اَور عورت کے اِس جسمانی ملاپ میں وُہ رُوحانی قدریں بھی سمٹ آتی ہیں جو زندگی کا عطر ہیں اَور جن کے بغیر زندگی ٹھوس اَور سپاٹ رہتی ہے۔

مناسب ہوگا اگر یہاں مَیں مشہور چینی خاتون' میڈم کوآن کی وُہ بے مثال نظم بھی درج کر دُوں جو اُس نے اپنے (مجسمہ ساز) شوہر کو اُس وقت لکھی تھی جب وُہ کسی دُوسری عورت کی طرف مائل ہو گیا تھا اَور جسے پڑھ کر وُہ اِس قدر متاثر ہُوا تھا کہ دُوسری عورت سے قطع تعلق کر کے شاعرہ (یعنی اپنی بیوی) کے پاس واپس آ گیا تھا...... یہ نظم عورت اَور مرد کے جسمانی اَور رُوحانی ملاپ کی نہایت قابلِ قدر مثال ہے:

آج میرے اَور تیرے درمیاں
بُعد کیسا — فاصلہ باقی کہاں؟
لے ذرا مٹی کی اِک چکنی ڈلی
ڈال پانی، گوندھ اِس کو زور سے
اور بنا دو' بُت، حسین و لاجواب
ایک بُت کی شکل ہو تیری طرح
دُوسرا بُت ہو میرا —
بُت شکن بن کر انھیں اَب توڑ دے

ڈال پانی، گوندھ پھر اِن کو ذرا
اب بنا پھر دونوں بت
ایک اپنا — اِک مِرا
اب مِرے بت میں ہے کچھ تیرا وجود
اور ترے بت میں ہے کچھ پیکر مِرا
زیست کی وہ کون سی طاقت بتا
تجھ کو کر سکتی ہے مجھ سے اب جُدا!

بہرحال محبت میں جسمانی ملاپ کے سلسلے میں اِس بات کو مدِنظر رکھنا لازمی ہے کہ عورت کی دُنیا جذبات و احساسات کی دُنیا ہے اور جب اُسے محبت کے دوران میں اِس بات کا ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ مرد اُسے محض ایک جسم سمجھتا ہے اور جسم سے محض لذت کے حصول کا طالب ہے، تو وہ ایک بے جان پتلی بن کر رہ جاتی ہے اور مرد، بسا اوقات یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ وہ تو پتھر کے ایک بت سے بغل گیر ہے...... یوں عورت کا اِنتقام پورا ہو جاتا ہے اور وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے خود سے کہتی ہے: اُسے صرف میرا جسم درکار تھا، وہ اُسے مل گیا! اِس کے سوا میں نے اُسے کچھ نہیں دیا...... دیکھا جائے تو یہ شکست صرف مرد کی شکست نہیں، یہ مرد اور عورت کی باہمی زندگی میں مسرت کی بھی شکست ہے۔

غائر نظر سے دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ عورت اور مرد کی باہمی زندگی میں "پیار حاصل کرنا" اور "پیار مہیا کرنا" خاصے اہم نکات ہیں اور محبت کی کامیابی کا تمام و کمال اِنحصار اِن کے مناسب حل پر ہے۔ یہ احساس کہ کوئی ہمیں پیار کرتا ہے، بے اندازہ مسرت کا حامل ہے...... اِس میں کوئی شک نہیں...... اور خاص طور پر وہ لمحات تو آسمانی ہوتے ہیں جب اِنسان محبوب کی تمام تر شفقت اور محبت کا مرکز قرار پاتا ہے۔ اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محبوب کو پیار کرنے میں جو لطف و مسرت ہے، عام زندگی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی؛ اور یہ کہنا بھی شاید غلط نہ ہو کہ لطیف ترین مسرت اس محبت میں پنہاں ہے جو بیک وقت حاصل بھی کی جاتی ہے اور نچھاور بھی...... محبت جس میں اتنی از خود روانی (spontaneity) ہوتی ہے کہ طالب و مطلوب کا اِمتیاز یکسر اُٹھ جاتا ہے اور دو مختلف ہستیاں روحانی اور جسمانی ملاپ کے باعث ایک ایسی تیسری اِجتماعی شخصیت میں نمودار ہوتی ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی تفریق باقی نہیں رہ جاتی۔

مغرب کے مشہور مفکر برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) نے اِس سلسلے میں ایک نکتہ پیش کیا ہے جو ہم سب کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس مفکر کے مطابق محبت سے دو طرح کی مسرت

حاصل کی جا سکتی ہے:

> فرض کیجیے، آپ ایک بادبانی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ سامنے آپ کو ساحل کا ایک حسین و دل فریب منظر نظر آتا ہے اور آپ یک لخت اس منظر کی سحر انگیز تابندگی سے مخمور ہو کر ساحل کے لیے پیار کی ایک لہر محسوس کرتے ہیں۔ اس پیار میں آپ کو ایک عجیب طرح کی مسرت کا احساس ہوگا۔ اب فرض کیجیے آپ کا یہ جہاز تباہ ہو گیا ہے اور عین اس وقت جب آپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں، آپ کو ساحل نظر آ جاتا ہے: آپ فوراً مسرت کی ایک والہانہ لہر محسوس کریں گے؛ لیکن یہ مسرت پہلی مسرت سے قطعاً مختلف ہوگی کیونکہ یہ ساحل کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں، یہ ساحل کے طفیل موت سے محفوظ رہنے کی وجہ سے ہے۔ یہی حال انسانی محبت کا ہے۔ اگر آپ محبوب کو اس لیے چاہتے ہیں کہ اس چاہت میں آپ کو ایک نئی مسرت ملتی ہے تو یقیناً آپ کی یہ مسرت ارفع ہے؛ لیکن آپ محبوب کو اس لیے پیار کرتے ہیں کہ اس سے آپ اپنے غم و آلام کو فراموش کر سکیں تو یہ محض ایک فرار ہے اور نتیجتاً اس سے حاصل شدہ مسرت، دائمی اقدار کی حامل نہیں ہو سکتی۔

آخر میں مجھے مسرت کی اس انوکھی کیفیت کا تذکرہ کرنا ہے جو ازدواجی زندگی کے اس مقام پر نمودار ہوتی ہے جہاں مرد اور عورت، اپنے جسموں اور روحوں کا حیرت انگیز ملاپ ایک تیسری ہستی میں دیکھتے ہیں...... یوں کہ نہ تو عورت دعویٰ کر سکتی ہے کہ یہ تیسری ہستی یعنی بچہ تمام کا تمام اس کی تخلیق ہے اور نہ ہی مرد دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ فقط اس کی تخلیق ہے (محبت کا تدریجی ارتقا از مصنف)۔ اب بچے کے لیے مرد اور عورت کی محبت اس لیے اہم ہے کہ اس کی نوعیت محبت کی عام کیفیات سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ مرد اور عورت کی باہمی محبت میں حسن اور کشش کو دخل ہوتا ہے۔ دوست کے لیے محبت اس کی خصوصیات کی بنا پر ہوتی ہے۔ اگر یہ کشش جاتی رہے یا خصوصیات میں نمایاں تبدیلی آ جائے تو محبت کی چنگاریوں کے سرد پڑ جانے کا بھی احتمال ہے؛ لیکن اس سب کے برعکس جب والدین اپنے بچے سے محبت کرتے ہیں تو یہ محبت مستقل اقدار کی حامل ہوتی ہے۔ ویسے "حیوانی زندگی" میں بھی بچے کے لیے شفقت بڑی نمایاں ہے اور اس جنسی محبت سے یکسر مختلف ہے جو مثلاً نر اور مادہ ایک دوسرے کے لیے محسوس کرتے ہیں۔ انسانی زندگی میں کنبے کی بقا اور مسرت کا سارا دارومدار اس محبت اور شفقت میں ہے جو والدین اور بچوں کے مابین استوار ہوتی ہے۔ لیکن شاید بچے کی محبت میں والدین کی بے پناہ مسرت کا راز احساسِ بقا (Sense of Immortality) میں مضمر ہے۔ وہ یوں کہ شروع ہی سے انسانی غم و اندوہ کا باعث زندگی کی فانی کیفیات رہی ہیں...... وہ فانی کیفیات جن کے پیشِ نظر انسان زندگی سے شدید وابستگی پیدا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس کی زندگی غیر مرئی نہیں، اسے ہر لحظہ فنا ہو جانے،

کھو جانے، حرفِ غلط کی طرح مٹ جانے کا خطرہ درپیش رہتا ہے...... ایسے میں زندگی سے کیا مسرت حاصل ہو سکتی ہے! لیکن اِس غم سے نجات دِلانے میں اُس محبت اَور شفقت نے ضرور حصّہ لیا ہے جو وہ اَپنے بچوں کے لیے محسوس کرتا ہے اَور جس کے باعث اُسے اِس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وُہ فانی نہیں، وہ بہتی ہُوئی شاداں و فرحاں زندگی کی ایک موج ہے...... وہ اُس تسلسل کا حصّہ ہے جو ازل سے اَبد تک جاری رہتا ہے، جسے کبھی فنا نہیں اَور جس سے زندگی کی ساری رعنائیاں عبارت ہیں۔ چنانچہ اَیسا اِنسان خود کو کائنات کا ایک ضروری جُزو سمجھتے ہوئے اُس کی لازوال مسرّتوں کا رَس نچوڑ لیتا ہے اَور اُسے اِس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کسی روز اُس کا یہ جسم فنا ہو جائے گا، اَور خیال بھی کیونکر آئے جب وُہ جانتا ہے کہ وُہ اُن لوگوں سے شدید طور پر وابستہ ہے جو اُس کی اپنی تخلیق ہیں اَور جو زندگی کے اِس تسلسل کی ڈور کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیں گے۔

maablib.org

مسرت اُور آرٹ

ایک مشہور انشا پرداز نے زندگی سے متعلق تین اہم اِنسانی نظریات پیش کیے ہیں۔ پہلا نظریہ اُن لوگوں کا ہے جن کے مطابق زندگی اِس دُنیا میں وارِد ہونے، کھانے پینے، سونے جاگنے، جنسی رِشتے اُستوار کرنے اُور پیری کی منازل سے گزر کر موت کے دُھندلکوں میں کھو جانے کا نام ہے۔ ایسے لوگ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے علَم بردار بن کر زندگی کے کارواں کے ساتھ چلتے اُور ہر قدم پر خود غرضی کے شدید رُجحانات کا مظاہرہ کرنے ہی کو حیات کا منتہا سمجھتے ہیں۔

دُوسرا نظریہ اُن لوگوں کا ہے جو زندگی کو "بیوپار" کا مترادف قرار دیتے ہیں اُور جن کی دانست میں ہر اِقدام کسی مستقل فائدے کے تابع ہونا چاہیے۔ یہاں مُسرت 'جہد للبقا' میں کامرانی کا دُوسرا نام ہے؛ لہٰذا اِسے حاصل کرنے کے لیے تشدّد کے تمام اِقدامات جائز اُور ضروری تصور کیے جاتے ہیں۔ اِس دُنیا میں اُمیر، غریب کو کچل دیتا ہے؛ سرمایہ دار، مزدور کا خون چُوس لیتا ہے؛ طاقت ور حکومت، کمزور ریاست کو نگل جاتی ہے اُور یُوں اُس جذبے کو تسکین ملتی ہے جو تخریب اُور فنا کا طالب ہوتا ہے ...... یہاں مُسرت دُوسروں کو کچل کر، کامرانی کے آستانے پر پہنچنے کے سوا کچھ نہیں ...... یہ نظریہ بھی پہلے نظریے کی طرح اِنسانیت کی اعلیٰ اَقدار سے خاصا پست ہے اُور اِس کے ساتھ تطابق، حیوانی خواہشات کی تکمیل کا مظہر ہے۔

تیسرا نظریہ ایک ایسے فرد کا نظریہ ہے جو زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی بہ نسبت زندگی کو بہت کچھ تفویض کرنے ہی کو اِنسانیت کا اعلیٰ معیار قرار دیتا ہے۔ وُہ ہر قدم پر سماج کے ذہنی اِرتقا اُور افراد کی مُسرت و عظمت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ تاریخ بھی اُنھیں لوگوں کو یاد رکھتی ہے، جنھوں نے اِجتماعی زندگی

کو اپنی کسی پیشکش کے طفیل رعنائی بخشی۔ لیکن یہاں بھی اس پیشکش کی مستقل حیثیت عارضی صورت گری کو پس پشت ڈال دیتی ہے؛ اس لیے وہ لوگ انسانیت کے زیادہ محسن قرار پاتے ہیں جنھوں نے اپنی کسی پیشکش کے طفیل نہ صرف اپنی سوسائٹی بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ہزار ہا برس تک حصولِ مسرت کے مواقع بہم پہنچائے۔ ایسے لوگوں میں اُن فن کاروں کا درجہ انتہائی بلند ہے جو آرٹ اور لٹریچر کی تخلیقات کے ذریعے اجتماعی مسرت میں مستقل اضافے کے محرک بن کر انسانیت کو بلند تر کرنے میں ممد ثابت ہوئے۔ اس انسانی نظریے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ مسرت کا حصول اتنا اہم نہیں جتنی کہ مسرت کی تقسیم۔

زندگی میں "فن" کا یہ اعلیٰ و ارفع مقام کہ یہ اجتماعی مسرت میں اضافے کا موجب قرار پائے، ادب برائے ادب اور ادب برائے حیات کے بیشتر بحث طلب مسائل کو بھی پس پشت ڈال دیتا ہے اور ہم صاف طور پر دیکھ لیتے ہیں کہ آرٹ کا مقدس فریضہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کو ذہنی تسکین بہم پہنچاتا ہے۔ آرٹ کیا ہے...... یہ کسی حساس فرد کے اُس ذہنی ردِ عمل کے کامیاب اظہار کا نام ہے جو ماحول کی کسی کروٹ کے طفیل معرضِ وجود میں آیا اور جس کے ذریعے آرٹسٹ نے اپنے لطیف و جمیل حساسات کو اس خوبی سے اظہار کا جامہ پہنا کر دوسروں تک پہنچایا کہ انھیں محسوس ہوا گویا وہ خود اُنھی احساسات کا اظہار کر رہے تھے۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ اجتماعی مسرت میں اضافے کے لیے آرٹ کی ہر تخلیق کو دو اہم فرض ادا کرنا پڑتے ہیں۔ پہلا یہ کہ تخلیق، آرٹسٹ کے لطیف و جمیل حساسات اور گہرے تجربات کی ترجمانی کرے؛ اور دوسرا یہ کہ اُن کیفیات کو ایسے فنکارانہ انداز سے پیش کرے کہ ناظر اور آرٹسٹ کے احساسات ہم آہنگ ہو جائیں اور دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑکتے جائیں...... بقولِ غالب:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایک خوبصورت تصویر جو دیکھنے والے کو زندگی کا وہی منظر اُسی شدت اور انداز سے دکھائے جیسے آرٹسٹ نے اُسے خود دیکھا تھا؛ ایک مدھر الاپ جو جذبات کی اُسی گہرائی اور احساس کی اُسی شدت کو سننے والے تک پہنچائے جو اُس کے خالق کے دل میں موج زن ہوئی تھی؛ اور ایک اعلیٰ ادبی کاوش جو لکھنے والے کے احساسات و نظریات کو قاری تک اُسی رنگ میں پہنچائے جو اُس کے خالق کی چشمِ تصور کا

کرشمہ تھا...... یہی آرٹ کا کام اور یہی اس کا مقام ہے اور یہی وہ انداز ہے جس پر چل کر آرٹ ابدی رنگ حاصل کر لیتا ہے اور افراد کے دلوں کو بے پایاں لازوال مسرت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔

یہاں غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ فن درحقیقت "کہانی کہنے" کی شدید ضرورت کے پیشِ نظر معرضِ وجود میں آتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ کہانی الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر نکلتی ہے، یا موسیقی کی لہروں کا روپ دھارتی ہے، یا سنگ یا تصویر کے لطیف و جمیل نقوش کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ دراصل یہ کہانی کہنے والے کے غیر شخصی احساسات، خیالات اور جذبات کا سلسلہ ہے جسے وہ دوسروں تک پہنچا کر، انھیں اپنے تجربات میں شریک کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جتنی بشدت اور سچائی کہنے والے کے تجربات میں ہوگی، اتنے ہی انہماک اور تن دہی سے وہ انھیں دوسروں تک پہنچانے کی سعی کرے گا جس سے اُسے ایک عجیب سی ذہنی تسکین حاصل ہوگی۔ نفسیاتی طور پر کہانی کہنے والا، دوسروں کو اپنے ذاتی تجربات میں شریک کر کے، خود کو احساسِ تنہائی سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ آرٹ کی تخلیقات کے لیے فنکارانہ اظہار بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس پر آرٹ کی کامیابی کا خاصا انحصار ہوتا ہے۔ چونکہ ان احساسات و تجربات کی سچائی لطافت اور عمومیت بھی اہم ہے جنھیں فن کار دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے، اس لیے آرٹ کی ہر تخلیق کو پوری کامیابی حاصل کرنے کے لیے دہرا پارٹ ادا کرنا پڑتا ہے۔

انگریزی زبان کے ایک مشہور انشا پرداز نے آرٹ اور سائنس پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> آرٹ کی اصل قیمت محض اس کے فنکارانہ اظہار میں نہیں، وہ اس قیمتی ذہنی اور احساسی سرمایے میں بھی ہے جو کسی تخلیق کے پس پشت موجود ہوتا ہے...... آرٹ کی اعلیٰ تخلیقات، صرف اس لیے اعلیٰ ہوتی ہیں کہ جوں جوں ہمارا ذہنی افق وسیع ہوتا ہے اور ہمارے تجربات بڑھتے ہیں، توں توں ہم ان کی سچائی کے زیادہ قائل ہوتے چلے جاتے ہیں؛ اور ہم خوبصورتی کو جس قدر پرکھنے کے زیادہ قابل ہوتے ہیں، اسی قدر ہمیں ان تخلیقات کے حسن کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے۔ لیکن اعلیٰ تخلیقات کی خوبی یہ ہے کہ وہ بچے سے لے کر بوڑھے تک، ہر ایک کو اپنے سحر میں اسیر کر سکتی ہیں...... بچے کو اپنے فنکارانہ اظہار کے طفیل اور بوڑھے کو قیمتی ذہنی سرمایے اور فنکارانہ اظہار کے امتزاج کے ذریعے۔ اور اس بات سے کسے انکار ہوگا کہ آرٹ کا وسیع اطلاق اجتماعی مسرت میں بے مثال اضافے کا موجب ثابت ہوتا ہے!

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اجتماعی مسرت میں اضافہ آرٹ کا شعوری مقصد ہے۔ دراصل

"انسان خود تخلیق نہیں کرتا، تخلیقی جوہر اپنے اظہار کے لیے انسان کو آلۂ کار بنا لیتا ہے۔" حیاتیاتی طور پر بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے قوائے ذہنی اُس کی جسمانی نشوونما کی بہ نسبت جلد ترقی کرتے ہیں، لہٰذا جانوروں کے مقابلے میں اُسے زیادہ احساسِ کمتری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جہاں وہ جسمانی طور پر جانور سے کئی گنا زیادہ وقت لے کر اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے، وہاں انسان ذہنی طور پر جانور سے بہت زیادہ اور کہیں چھوٹی عمر میں ماحول کا اِدراک کر لیتا ہے: جسمانی ترقی اور ذہنی نشوونما کے مابین تضاد اُسے اِس شدت سے اپنی کمزوریوں کا احساس دلاتا ہے کہ اُس کی زندگی کی ہر کاوش اِس احساسِ کمتری کو مغلوب کرنے اور اپنی تکمیل تک پہنچنے کے سوا دوسرا کوئی مقصد اپنے پیشِ نظر نہیں رکھتی۔ ایسی کاوشوں میں اُس کا یہ اِقدام کہ وہ تنہائی سے گریزاں رہے اور اجتماع و انبوہ میں زندگی بسر کرے، بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہر فرد سوسائٹی کے ساتھ کئی مستقل یا غیر مستقل رشتے قائم کرتا ہے...... اِن رشتوں میں گفتار، عقلی شعور، محبت اور آرٹ کی تخلیقات زیادہ اہم ہیں کہ ان کے طفیل وہ دوسرے افراد سے ہم کلام ہو کر اُس احساسِ تنہائی سے چھٹکارا پا لیتا ہے جو اُس کی کمتری نے اُس پر بزور عائد کیا تھا۔

لیکن زیادہ تر رشتے قدرت کی دین ہیں اور اُن کی نمود میں اِنسان کی شعوری کاوشوں کو بہت کم دخل حاصل ہے۔ حیاتیاتی طور پر یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسان، جانور یا پودے میں کسی قسم کی کمی فوراً قدرتی طریق سے معاوضہ حاصل کر لیتی ہے۔ ایک بیمار پودا بہت جلد، بڑی شدت سے پھول نکالتا ہے تاکہ اپنی حیاتِ چند روزہ میں تکمیل کو پہنچ سکے۔ یہی حال انسان کا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ تخلیقی جوہر کا دباؤ اُن لوگوں میں زیادہ شدید ہوتا ہے جو فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کمی کا بھی شکار ہوتے ہیں۔

ادب کی تاریخ میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں...... سورداس اور ملٹن کی بینائی زائل ہو چکی تھی، بیتھوون بہرا تھا، بائرن لنگڑا اور کیٹس دق کا مریض تھا...... بڑے فن کاروں کی زندگی کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اُن کے جسم یا کردار میں ایسی کوئی نہ کوئی کمی ضرور نظر آئے گی جسے پورا کرنے کے لیے قدرت نے اُن کے تخلیقی جوہر کو مہمیز دی اور وہ حیرت انگیز تخلیقات کے خالق بننے پر مجبور ہوئے۔

نفسیات کی رُو سے آرٹ کی یہ تخلیقات اُن خواہشات کا اظہار ہیں جو حقیقت میں پوری نہ ہو سکیں اور فن کاروں نے نفسِ لاشعور کا دامن پکڑ کر آرٹ کے ذریعے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نفسیات کو اُس تخلیقی جوہر کے وجود کو تسلیم کرنا پڑا ہے جو مصنف کی ہستی پر بُری طرح چھا جاتا ہے۔ بقولِ ریاض احمد:

> ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ انسان تخلیق نہیں کرتا، تخلیقی جوہر اپنے اظہار کے لیے انسان کو آلۂ کار بنا لیتا ہے۔

یہ تخلیقی جوہر وہی چیز ہے جسے ابو الکلام آزاد نے "ادیب کی فکری انفرادیت کے ایک قدرتی سرجوش" سے (جسے دو دبا نہیں سکتا) اور مشہور چینی فلسفی لن یو تانگ نے "تخلیقی اور فنکارانہ تحریک" سے موسوم کیا ہے۔ موخر الذکر مصنف کی رائے میں:

> ہم آرٹ کو اُس وقت تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں جب تک کہ ہم اُسے محض جسمانی اور ذہنی قوتوں کا وہ سرجوش تسلیم نہ کریں جو آزاد طوفانی ندی کی طرح کناروں سے چھلک جاتا ہے۔

ذہنی اور جسمانی قوتوں کا یہ سرجوش انسان کو کچھ نہ کچھ تخلیق کرنے پر ضرور مجبور کرتا ہے؛ اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم ایک سیاح کے جذبۂ سیاحت یا ایک سائنس داں کے جذبۂ تحقیق سے موسوم کر سکتے ہیں۔ زیادہ موزوں الفاظ میں جس طرح بچہ جسمانی قوت کی فراوانی کے تحت چلتے چلتے کودنے لگتا ہے یا نوجوان اسی کے زیر اثر تھرکنا شروع کر دیتا ہے اُسی طرح جسمانی اور ذہنی قوتوں کا کناروں سے توڑ کر بہہ نکلنا آرٹ کی تخلیقات کا موجب قرار پاتا ہے اور یہ سارا عمل اتنا غیر شعوری ہوتا ہے کہ آرٹ کے خالق کو خود پتا نہیں چلتا کہ کس پُراسرار طریق سے ایک بلند پایہ چیز کی تخلیق ہو گئی!

مگر اس سے یہ مراد لینا بھی درست نہیں کہ ایک اعلیٰ تخلیق از سرتاپا لاشعوری تحریکات کی مرہونِ ہوتی ہے کیونکہ تخلیق آرٹ کے اعلیٰ معیار کو اُس وقت تک نہیں چھو سکتی جب تک کہ فن کار اُس میں کچھ نہ کچھ شعوری کاٹ چھانٹ اور ردوبدل نہیں کرتا۔ ایڈیسن (Edison) نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ It is one percent inspiration and ninety-nine percent perspiration یعنی کسی فن پارے کی تخلیق میں ننانوے فیصدی خون پسینہ اور صرف ایک فیصدی الہام کا عنصر ہوتا ہے۔ بہر حال وثوق کے ساتھ اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جہاں اعلیٰ تخلیق کی روح لاشعوری کیفیات سے متاثر ہوتی ہے وہاں اس کے ڈھانچے کی تعمیر میں کسی نہ کسی حد تک فن کار کا شعور بھی دخل اندازی کرتا ہے۔

جدید ترین نفسیاتی تحقیقات کی روشنی میں آرٹ کے پس منظر کی طرف رجوع کیا جائے تو ہم پر منکشف ہو گا کہ آرٹ کی تخلیق، دو مختلف ذہنی منازل کے مابین اُس "ربط" کا دوسرا نام ہے جسے آرٹسٹ شدتِ احساس اور نظرِ عمیق سے دریافت کر لیتا ہے۔ نفسیات نے اس چیز کو آرٹ کے عمل مرابطہ کا نام دیا ہے اور اس کی توضیح یوں کی ہے کہ جس طرح مزاح کی تخلیق دو مختلف اشیا کے مابین داخلی اور خارجی ربط کی رہینِ منت ہے اُسی طرح آرٹ کی تخلیق کا راز بھی دو مختلف ذہنی منازل کے درمیان ایک ربط کی دریافت کا مرہون ہے۔ ان دو ذہنی منازل میں ایک تو وہ ہے جہاں روز مرہ

خیالات کی سطحیت میں لپٹے ہوئے نظر آتی ہے اور دُوسری وہ جو ہماری روز مرّہ زندگی اور اس کی سطحیت کے پس پشت ایک بحرِ بے کنار کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور جس میں ابدیت کے سارے عناصر سرگرمِ عمل ہیں۔ آرٹ کی تخلیق اِن دو منازل کو مربوط کرنے ہی کا دُوسرا نام ہے۔ شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ فن کار کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کرتا وہ دو چیزوں کے مابین صرف ایسا ربط پیدا کرتا ہے جو اس سے قبل پیدا نہیں ہوا تھا۔ تشبیہ، استعارہ کہ ادب کی جان ہیں اسی ربط کی نمایاں مثالیں ہیں۔ لیکن جہاں تشبیہ، استعارے یا مزاح کے ایک ٹکڑے میں صرف وقتی حیرت کا عنصر ہوتا ہے، وہاں فن، مستقل حیرت کا امین ہوتا ہے جو فن کار اور ناظر دونوں کو یکے بعد دیگرے کئی ایک حیرت زا لمحات ودیعت کرتے چلا جاتا ہے۔

تخلیقی جوہر کا عمل اگرچہ غیر شعوری ہے لیکن یہ آرٹ کے خالق کو مسرّت سے ضرور ہم کنار کرتا ہے۔ نفسیات نے اِسے اس "تسکین" کا نام دیا ہے جو کسی چیز کی تخلیق سے حاصل ہوتی ہے، چاہے یہ تخلیق ایک حسین بت ہو یا حسین پینٹنگ، چاہے حسین نظم یا حسین نغمہ۔ ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ "آمد" کے وہ لمحات، جب جسمانی اور ذہنی قوا سمٹ کر ایک نقطے پر جمع ہو جاتے ہیں اور انسان گرد و نواح سے بے خبر ہو کر اپنی تخلیق میں یکسر کھو جاتا ہے، انتہائی ذہنی مسرّت کے لمحات ہوتے ہیں...... یہ وہی لمحات ہیں جن کے متعلق ولیم ہیزلٹ ایسا جذباتی انشا پرداز بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے:

> ...... آہ بے قرار مسرّت کا وہ ایک لمحہ جب ذہن کو وہ نئی بات سوجھتی جو پھر کبھی بٹ نہیں سکتی! مجھ سے دُنیا بھر کی کامرانیاں چھین لو اور مجھے صرف دل سے نکلی ہوئی وہ ایک آہ بخش دو جس کے طفیل کوئی نوجوان مصنف ابدیت کو پہلی بار اپنی دلھن بناتا ہے......

تاہم ولیم ہیزلٹ اس بے کنار مسرّت کا تو قائل ہے جو تخلیقی لمحات میں وارد ہوتی ہے مگر اس مسرّت کا بالکل قائل نہیں جو تخلیق کو دیکھ کر مصنف کو محسوس ہوتی ہے۔ اس کی رائے میں:

> جب ایک بار کوئی چیز تخلیق ہو جائے تو اس کے خالق کے لیے نہ تو اس میں کوئی دلچسپی باقی رہتی ہے اور نہ ہی مسرّت...... ایک آرٹسٹ کو بھی اپنی تکمیل یافتہ پینٹنگ دیکھ کر وہ مسرّت حاصل نہیں ہو سکتی جو تخلیق کے دوران میں اُسے حاصل ہوئی تھی۔

مجھے ذاتی طور پر ولیم ہیزلٹ کے اس خیال سے اتفاق نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک اعلیٰ تخلیق اس کے خالق کا ایسا قیمتی اثاثہ ہوتی ہے جسے وہ نہ صرف تا دمِ مرگ فراموش نہیں کر سکتا بلکہ جو بدلتی ہوئی زندگی کے ہر مقام پر اُسے بے پایاں مسرّت مہیا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ ممکن ہے ہیزلٹ

نے انگریزی فضا میں بڑی خود اعتمادی کے تحت یہ الفاظ کہے ہوں...... ہاں تو یہ بات نہیں۔

تخلیق کے وقت مسرت کی تحصیل یا بعد ازاں تخلیق کا جائزہ لیتے وقت، مسرت کا حصول تو فن کار کو ضرور ارزانی ہوتا ہے، لیکن اس بات سے انکار نہ ہو سکے گا کہ تخلیقی کارناموں سے ہٹ کر فن کار کی زندگی مسرت کی اس ملائم اور خوشگوار رَو سے ضرور محروم رہتی ہے جو ایک درمیانے درجے کے خوش باش انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ تخلیقی جوہر کا دباؤ فن کار کے سراپے پر اس درجہ مسلط ہو جاتا ہے کہ وہ خوش اسلوبی سے زندگی کے کرخت حقائق کا ساتھ دینے کے زیادہ قابل نہیں رہ جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فن کار ارزاں قسم کی جذباتی تسکین کی خاطر بعض اوقات شراب نوشی کی طرف بھی مائل ہو جاتے ہیں۔ آپ میں سے جن لوگوں کو مارگرٹ مچل کا مشہور ناول Gone with the Wind پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، انھیں ایشلے کا وہ خوبصورت، شاعرانہ کردار ضرور یاد ہوگا جو فلکِ ناہنجار کے ایک ہی تھپیڑے سے زندگی کے کرخت اور ہولناک حقائق سے دوچار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لطیف اور سبک خوابوں کا سارا رنگین طلسم ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو گیا۔ غالباً کرشن چندر نے اپنے کسی افسانے میں لکھا ہے کہ "یہ خواب بُرے نہیں ہوتے، صرف ان کا ٹوٹ جانا بُرا ہوتا ہے اور یہ سپنے بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔" فن کار کی زندگی میں اُداسی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اُس کے سپنوں کے رنگین حباب، حقائق کے سنگریزوں سے اکثر ٹکرا جاتے ہیں۔

فن کار کی عام زندگی میں مسرت کی کمی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اُس کا ذہنی عروج اُسے عوام کی سطح سے اس قدر بلند کر دیتا ہے کہ وہ خود کو سوسائٹی میں ایک اجنبی کے روپ میں دیکھتا ہے اور اُسے انبوہ میں ہوتے ہوئے بھی شدید احساسِ تنہائی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ زندگی میں مسرت حاصل کرنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ اپنے ماحول کے افراد سے نہ تو ذہنی طور پر بلند ہوں اور نہ ہی پست۔ اگر آپ پست ہوئے تو لوگ آپ کو اپنے پیروں تلے روند ڈالیں گے اور اُن سے بلند ہوئے تو وہ آپ سے بے اعتنائی برتیں گے۔ فن کار کی ذہنی بلندی اُسے ایسے ہی بدنصیبوں میں لا کھڑا کرتی ہے۔

لیکن فن کار کا احساسِ تنہائی جہاں اُسے اوسط درجے کی خوش باش زندگی سے محروم رکھتا ہے وہاں اُس کا ردِ عمل اپنے پُراسرار طریقِ کار کی بدولت اُس کی رُوح کے اس خلا کو پُر کرنے اور اُسے احساسِ تنہائی سے چھٹکارا دلانے میں مدد ضرور بہم پہنچاتا ہے۔ اس ردِ عمل کی نوعیت دو طرح کی ہوتی ہے، اس لیے

فن کار مختلف مدارج کا ادب پیدا کرتا ہے۔ جہاں ایک لمحے وہ خود ناظر کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور زندگی کے ہنگاموں کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے، وہاں دوسرے ہی لمحے خود کو وسعت اور پھیلاؤ سے ہم آہنگ کر کے اپنی محدود انفرادیت کو یکسر تج دیتا ہے۔ اول الذکر لمحہ اُسے مزاح، تنقید اور طنز کی تخلیق کی طرف مائل کرتا ہے، یعنی وہ تمام چیزیں جن کے ذریعے وہ ایک احساسِ برتری محسوس کر کے دوسروں کی ناہمواریوں پر ہنس سکے یا اُن پر طنز کر سکے یا مختلف اشیا کا تنقیدی جائزہ لے سکے۔ لیکن موخر الذکر لمحہ اُسے تماشائی کی حیثیت سے بلند کر کے ایسی احساسی چیزیں تخلیق کرنے کی طرف مائل کرتا ہے جن میں وہ خود کو کائنات کے وسیع پھیلاؤ اور لامحدود کیفیات سے ہم آہنگ کر سکے۔ نیچرل شاعری بلکہ تمام داخلی شاعری کی تخلیق اسی ایک لمحے کی رہینِ منت ہے اور یہی وہ لمحہ ہے جسے صوفیا کرام اور ویدانتیوں نے لامحدودیت کے ساتھ وصال کا لمحہ قرار دیا ہے، یعنی جب "امتیازِ من و تُو" اُٹھ جاتا ہے اور زندگی پگھل کر ایک سہانے احساس میں بس جاتی ہے۔

یہاں تک ہم نے فن کار کے احساسات سے بحث کی ہے اور یہ دیکھا ہے کہ تخلیق کے وقت فن کار ایک روحانی سرور سے ہم کنار ہوتا ہے اور خود کو ایک مسرت انگیز لمحے سے ہم آہنگ کر لیتا ہے...... اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تخلیق کے دوران میں جب وہ خیالات کی ایک لطیف سطح سے یک لخت، لاشعوری طریق سے خیالات کی ایک لطیف تر سطح کو چھوتا ہے تو اُسے ایسا وسعت آشنا، مسرت زا احساس ہوتا ہے جسے کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں "احساسِ بحر آسا" سے موسوم کیا جا سکتا ہے، اور دیکھا جائے تو یہی احساسِ وسعت فن کار کی عزیز ترین متاع اور بے پایاں مسرت کا سب سے بڑا محرک ہے۔

اب ہم تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھنے کی سعی کرتے ہیں کہ تخلیق شدہ آرٹ کیسے اور کہاں تک افراد کو مسرت بخشنے میں کامیاب ہو سکتا ہے!

یہاں ہمارے لیے سب سے پہلے اس بات پر زور دینا نہایت ضروری ہے کہ درحقیقت آرٹ کی اصل روح اُس کی فطری آمد میں ہے اور یہ روانی جبھی آ سکتی ہے کہ بقولِ مولانا صلاح الدین احمد:

> فن کار اور فن کے متوالے اسے کسی خاص ڈھب پر چلانے کی کوشش نہ کریں، وہ اس کی روانی کو آزاد چھوڑ کر فن کو اپنی سطح آپ تلاش کرنے کی اجازت دیں۔

مولانا موصوف کا یہ ارشاد کہ آرٹ کی رواں دواں ندی کے راستے میں بند باندھنے کی کوشش فضول ہے، اپنی جگہ خاصا وزنی نظریہ ہے اور اس سے فن کی سچی کیفیات کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ فن کار

اَور اس کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے والے افراد اِس حقیقت کی رُوح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آرٹ کو ہر طرح کی مقصدیت سے بلند وبالا قرار دیں اَور اِسے جسمانی اَور رُوحانی قوتوں کا وہ سرجوش (overflow) تسلیم کریں جس کا کنارے توڑ کر بہ نکلنا ایک فطری بات تھی؛ نیز اِسے اُس شدید تجربے کے مخلصانہ اَور فنکارانہ اظہار سے موسوم کریں جس کے بغیر فن کار کا سانس رُک رہا تھا اَور جس میں شریک ہو کر خود افراد نے اُس تجربے کی گہرائیوں میں نہ صرف جھانکا بلکہ فن کار کے دوش بدوش اُس رُوحانی کیف وسُرور کے جام بھی پیے جو فن کار کو شدّتِ احساس نے فنی تخلیق کی صورت میں کسی ایک منزل پر پیش کر دیے تھے۔

شبلی نے بھی "شعرالعجم" میں ایک جگہ آرٹ کی اِس فطری آمد اَور نتیجۃً افراد پر اس کے حیرت انگیز اثرات کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> شاعر کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بے اختیار اُن جذبات کو ظاہر کرتا ہے، جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ بلاشبہ اشعار اَوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو اُن کے دل پر اثر کریں گے لیکن شاعر نے اس مقصد کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا؛ جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن کوئی شخص سن لے تو ضرور تڑپ کر رہ جائے گا۔

یہاں یہ اَمر واضح ہے کہ کسی فن پارے کے شدید تاثر کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ افراد کے احساسات، فن کار کے احساسات میں اپنا سچا عکس دیکھ کر ٹھٹھک جاتے ہیں۔ یہ چیز افراد کو بھی وہی ذہنی آسودگی بخشتی ہے جسے فن کار نے اپنے جذبات و احساسات کے کامیاب اظہار پر حاصل کیا تھا۔ اس میں نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ کسی اعلیٰ تخلیق کا مطالعہ کرتے وقت ناظر کو محسوس ہوتا ہے گویا وہ خود تخلیق کر رہا ہے۔ مسرت دراصل اِس بات میں ہوتی ہے کہ فن کار جس چیز کا اظہار کرے اُسے پڑھنے، سننے یا دیکھنے والا کہے گویا یہ اسی کے ذہن کی پیداوار ہے؛ اِس طرح فن کار کے تجربے میں شریک ہو کر ناظر بھی اس کا ہم نوا بن جاتا ہے اَور مسرت حاصل کرتا ہے۔ جہاں ایک اعلیٰ فنی کاوش فن کار کے خلوص اَور احساس کی غماز اَور صداقتِ تجربات کی ترجمان ہوتی ہے، وہاں وہ ناظر کی سعیِ تخلیقِ مکرر کے پرتو سے بھی جگمگاہٹ حاصل کرتی ہے...... یوں تخلیق کا مذاق، تخلیق کو خود حرارت؛ اُس کے احساسی سرمایے کو اپنی ذہنی اُڑان؛ اَور اپنے قیمتی ذہنی اَور احساسی سرمایے سے تقویت بخشتا ہے۔ ایسے مقام پر محسوس ہوتا ہے گویا دو، ایک جیسے اَذہان نے کسی فن پارے کی تخلیق میں یکساں حصّہ لیا ہو...... ایک ذہن تو خود فن کار کا تھا اَور دوسرا اُس شخص کا جس کے احساسات و تجربات کی سطح وہی تھی جو فن کار کی تھی اَور

جس نے خود کو فن کار کی ذہنی کیفیات سے یکسر ہم آہنگ پایا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے دل پسند مصنف کی دریافت ہر ذہین فرد کی احساسی زندگی کا نازک ترین اور مسرت انگیز مقام ہوتا ہے کہ اس سے اُسے وہ آئینہ مل جاتا ہے جس کے ذریعے وہ خود اپنے احساسات و جذبات کا جائزہ لیتا ہے، اپنے تجربات کا دُوسرے کے الفاظ میں اظہار کرتا ہے اور یوں بے پایاں اور لازوال مسرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

لیکن جہاں اس بات کی سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ ہر فن پارے میں اشاریتی عنصر کی اتنی فراوانی ہوتی ہے کہ مطالعہ کرنے والے کو اپنی سعیِ تخلیقِ مکرر کو بروئے کار لانا پڑتا ہے تاکہ وہ فن پارے سے پوری طرح محظوظ ہو سکے، وہاں اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بعض فن پارے اپنی تیز روانی میں ناظر یا قاری کے احساسات و جذبات کو یوں بہالے جاتے ہیں کہ اُس کے زورِ تخیل سے درخشانی حاصل کرنے کے بجائے خود اُس کے تصورات میں چکا چوند پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ چیز اُن لوگوں کو ارزانی ہوتی ہے جو زندگی کے کسی موڑ پر کسی بڑے فن کار کی تخلیقات سے دو چار ہوتے ہیں اور آنِ واحد میں اُس کے اظہار کی کرشمہ سازیوں اور اُس کے خیالات و نظریات کی سحر انگیز کیفیات میں یوں کھو جاتے ہیں کہ انھیں محسوس ہوتا ہے گویا وقت کی رفتار تھم گئی ہے اور زندگی ایک سہانے احساس میں بدلتے چلے جا رہی ہے۔

افراد کا کسی فن پارے کے سحر میں یوں اسیر ہو جانا کہ انھیں وقت کا احساس ہی نہ رہے، اپنے اندر ایک نہایت لطیف نفسیاتی درجہ رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر فرد زندگی کے کرخت حقائق سے گریز اختیار کرنے اور خوابوں کے لطیف و جمیل محلوں میں بسر اوقات کرنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ چنانچہ ایک اعلیٰ فن پارہ اُسے یک لخت سنگلاخ حقائق کی دُنیا سے بلند کر کے لطیف احساسات اور حسین خوابوں کی دُنیا میں پہنچا دیتا ہے جس میں انسان خود کو فن کار یا ہیرو کے احساسات سے اس طور ہم آہنگ کر لیتا ہے کہ ہیرو کے مصائب اُس کے اپنے مصائب بن جاتے ہیں اور ہیرو کی کامرانی اُس کی اپنی فتح! لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی: اگر ایسا ہو تو اس ڈرامے کا ایک کردار بن کر انسان وہ مسرت کبھی حاصل نہیں کر سکتا جو فی الواقع اُسے ملتی ہے۔ دراصل ہیرو کے ساتھ خود کو قطعی طور سے منسلک کرنے کے بعد بھی لوگ اپنی تماشائی کی حیثیت کبھی نہیں بھولتے: ہر بار ہیرو کے ساتھ آنسو بہانے اور مصائب اُٹھانے کے بعد وہ اپنی تماشائی کی حیثیت کی طرف بھی لوٹتے ہیں۔ کسی فن پارے کے مطالعے میں یہ "لوٹ آنا" ایک ایسا موڑ بن جاتا ہے جس کا انھیں کوئی شعوری احساس نہیں ہوتا اور جو جذبات کے تناؤ کو آسودہ کر کے انھیں ذہنی تسکین مہیا کرتا ہے اور خاص طور پر المیے کی تاریکیوں کو اُن کے لیے گوارا اور ممکن بنا دیتا ہے۔

تاہم یہاں ایک حل طلب مسئلہ باقی رہ جاتا ہے: وہ یہ کہ آرٹ میں المیے کا عنصر کیوں اور کیسے ذہنی آسودگی کا موجب ہے! یہاں دو ایک نکات کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تو بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ پہلا یہ کہ ہر فن کار، چاہے وہ افلاطون کے تخیلی نظریے کا حامی ہو چاہے ارسطو کی حقائق پسندی کا، کسی نہ کسی حد تک دروں بیں (Introvert) ضرور ہوتا ہے...... وہ اس لیے کہ ہر فنی تخلیق میں فن کار کے اپنے احساسات کو ضرور سرگرم ہونا پڑتا ہے جن کے بغیر حقائق کا اجتماع تو ممکن ہے، فنی تخلیق ممکن نہیں۔ ہر وہ فن کار جو اپنے احساسات کا جائزہ لیتا ہے، احساسِ تنہائی سے ضرور نبرد آزما ہوتا ہے...... یہ احساسِ تنہائی انسان کے احساسِ کم مائیگی کی پیداوار ہے، نفسیات میں جس کے متعلق دو آرا موجود نہیں۔ پھر بھی وہ احساسِ تنہائی ہے جو اپنی آسودگی کے لیے المیے کی تخلیق کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ یہاں فن کار دوسرے کرداروں کو اپنے احساسات و جذبات تفویض کر کے ایک طرح سے ذہنی تسکین حاصل کرتا ہے۔ ناظر کا المیے سے تسکین حاصل کرنا بھی اسی نفسیاتی عمل کا ایک پہلو ہے کیونکہ ناظر بھی دراصل وہی انسان ہے جو احساسِ کم مائیگی کا شکار تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ المیے کی تخلیق اُن انسانی احساسات و جذبات کے اظہار کی خاطر معرضِ وجود میں آئی ہے جو انسان کے احساسِ کم مائیگی کی پیداوار اور اظہار سے قبل اُس کے ذہنی کرب کا باعث تھے۔ اظہار نے اُن کی شدت کو انحطاط پذیر کر کے نہ صرف فن کار کو ذہنی آسودگی بخشی بلکہ ہر اُس انسانی ذہن کو بھی تسکین مہیا کی جسے احساسِ کم مائیگی و تنہائی نے مسرت سے محروم کر رکھا تھا۔

آخر میں مجھے فن سے حصولِ مسرت کے اس پہلو کا تذکرہ کرنا ہے جسے شبلی نے محاکات کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شاعری کا اصل مقصد طبیعت کا انبساط ہے، کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو شبلی کے یہ الفاظ جو انھوں نے صرف شاعری کے ضمن میں کہے تھے فن کی تمام مسلّمہ کیفیات پر پورا اترتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہی فنی تخلیقات ہمیں زیادہ متاثر کرتی ہیں جو اصل کے زیادہ قریب ہوں اور جن میں سچائی اور خلوص کا عنصر بے پایاں ہو۔ ایسی تخلیقات دراصل زندگی اور اس کی تمام کیفیات کی صحیح نقل اور عمدہ ترجمانی کرتی ہیں۔ ازبسکہ انسان کو نقل یا ترجمانی سے محظوظ ہونے کی قدرتی صلاحیت حاصل ہے، اس لیے وہ فن سے مسرت حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہی دراصل زندگی کا سچا عکس ہے۔

maablib.org

مسرّت اور فلسفہ ۱

والٹ وھٹ مین (Walt Whitman) ایک جگہ رقم طراز ہے:

> میرا خیال ہے کہ میں حیوانوں کے ساتھ مل کر بڑے مزے سے رہ سکتا ہوں۔ وہ اپنی حالت سنوارنے کے لیے خون پسینہ ایک نہیں کرتے...... نہ وہ طویل راتیں جاگ کر اور آنسو بہا کر بسر کرتے ہیں...... خدا کی طرف بھی اُن کے کوئی فرائض نہیں...... ایک بھی تو بے چین نہیں ایک بھی تو ملکیت کی خواہش نہیں کرتا...... اُن میں سے کوئی بھی تو کسی اپنے جیسے کے سامنے سر نہیں جھکاتا؛ اُن میں ایک بھی عزت و ناموس کا پرستار نہیں' ایک بھی تو غم زدہ نہیں!

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وھٹ مین کا یہ تاریک نظریۂ حیوان کے مقابل اِنسان کی تذلیل کے مترادف ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ حیوان اپنی سادہ اور طبعی زندگی کے باعث اُن آلام و مصائب' اُن آنسوؤں اور سسکیوں سے بہت حد تک محفوظ رہتا ہے جو اِنسان نے اپنے ذہنی اِرتقا کے طفیل خود پیدا کی ہیں؛ لیکن اِس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ حیوانی لذّت کو تج کر' اِنسان نے مسرت کی اُن اِرتقائی کیفیات تک بھی رسائی حاصل کی ہے جہاں حیوان ہزار سعی کے باوجود پہنچنے سے قاصر ہے۔

دیکھا جائے تو مسرت کا تصور شروع ہی سے اِنسان کے پیشِ نظر رہا ہے اور وہ اِس کے حصول کے لیے ہر وقت کوشاں ہے۔ جنگل میں حیوانی زندگی بسر کرتے وقت وہ ذہنی اُلجھنوں سے بے شک محفوظ تھا اور اپنی فطرت کے اِشاروں اور طبعی رُجحانات کے تقاضوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے' اُسے وہ بھرپور لذت بھی ضرور ملتی تھی جو حیوانی زندگی کا خاصا ہے؛ لیکن وہ اُس مسرت سے یقیناً محروم تھا جس تک ایک روز اُسے ذہن کی نئی کروٹوں کے طفیل رسائی حاصل کر لینا تھی۔ چنانچہ جیسے ہی اُس کی ذہنی ترقی نے اُس کے طبعی رُجحانات کو پس پشت ڈالنا شروع کیا' اُس کی چشمِ تصور کے سامنے مسرت کے

نقوش واضح ہونے لگ گئے۔ جلد ہی اُس نے اپنے لیے تہذیب و قانون کی ایک ایسی دُنیا تعمیر کر لی جہاں اُس کے طبعی رُجحانات پابہ زنجیر رہ سکیں اور اُن کی تندی و وحشت دائرۂ تہذیب میں آ کر متوازن اور پُرسکون ہو جائے۔ تاہم وہ اپنی فطرت کے اُن اولیں تقاضوں کو یکسر ناپید نہ کر سکا اور یہ تقاضے جنگ، جنسی وحشت اور انتقام کی صورت میں ہمیشہ اُس کے ساتھ وابستہ رہے۔ دیکھا جائے تو ننھی سی ایک معصوم آرزو ہمیشہ اُس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی کہ وہ کسی شام کے دُھندلکے میں واپس اپنی کھوئی ہوئی جنت یعنی جنگل میں واپس چلا جائے جہاں اُس کے جذبات کو کھلی چھٹی ملی تھی اور جہاں وہ آزاد منش آدم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بلا روک ٹوک اپنی خواہشات کی تسکین کر سکتا تھا: پھر بھی بسا اوقات اُس نے اپنی تہذیب بھری دُنیا میں اِس آرزو کو کچل دینے کی کوشش کی اور اصولاً جذبات اور طبعی رُجحانات کو نہ صرف فہم و ادراک کے تابع قرار دے لیا بلکہ ایک ایسی دُنیا بنانے کی بھی خواہش کی جہاں سے جذبات اور طبعی رُجحانات کو مکمل دیس نکالا مل جائے ...... یہی اُس کی غلطی تھی ...... محض فہم و ادراک کی زندگی اُسے وہ مسرت مہیا نہیں کر سکتی تھی جس کا وہ لاشعوری طور پر طالب تھا۔ یہی مسرت تو عقل و جذبات کے اِمتزاج ہی سے ممکن تھی: اِس کا مرکز نہ تو محض منطق و قانون تھا اور نہ ہی محض جسم اور حیوانی زندگی!

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا، حیوانی زندگی میں مسرت کا سوال ہماری بحث سے خارج ہے ...... اِس لیے کہ اُس زندگی میں واقعتہً مسرت کا وجود ہی نہ تھا! مسرت کے حصول کا سوال تو اِنسانی زندگی کے اُس مقام پر پیدا ہوا جہاں اُس کے فہم و ادراک کی ترقی نے اُس کے لیے بہت سی نئی ذہنی اُلجھنیں پیدا کر دیں اور اُسے اپنی کم مائیگی، تنہائی اور بے بسی کا احساس بری طرح ستانے لگا۔ جسمانی لذت تو اُسے اب بھی حاصل تھی لیکن وہ اُس "ذہنی لذت" سے یقیناً محروم تھا جو نئے شعور کے طفیل اُسے نئی دُنیا میں ملنا چاہیے تھی۔ اِسی لیے اُس کے [illegible] نئے خلا کو پُر کرنے کی شدید آرزو کروٹیں لینے لگی۔ لیکن وہ اِس خلا کو پُر کیسے کرے؟ اِس نئے مرض کا علاج کیا ہو؟ یہ بے چینی کیسے دُور ہو؟ ...... یہ تمام سوالات ایک نئے انداز سے اُبھر کر اُس کے سامنے آ گئے۔ جلد ہی اُسے محسوس ہونے لگا کہ اِس بے چینی کی وجہ تو وہ تاریکی ہے جو کائنات کے پُراسرار مسائل کے پیشِ نظر اُس کے ذہن پر مسلط ہے اور جسے چیر کر وہ صبحِ روشن کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ روشنی (light) ہی دراصل اُس کے اِس نئے مرض کا علاج تھی اور اِسی روشنی میں اُس کے بقول وہ مسرت پوشیدہ تھی جس کے لیے غیر شعوری

طور پر وہ خود کو اِس قدر بے قرار محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ انسانی ذہن کی ساری تاریخ اُس پروانہ وار تگ و دَو کا نام ہے جو اُس نے روشنی تک پہنچنے کے لیے کی: اِس تگ و دَو کو ہم فلسفہ کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔

مغرب میں اِس کا آغاز یونانی افکار سے ہُوا۔ ہریکلٹس (Heraclitus) نے، جسے "آنسوؤں والا فلسفی" کہا گیا ہے، سب سے پہلے یہ نکتہ پیش کیا کہ دُنیا میں تغیّر کو ثبات ہے اور ہر چیز ایک پیہم تبدیلی سے ہم کنار ہے۔ اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ کوئی شخص ایک ہی دریا میں دو دفعہ کُود نہیں سکتا کیونکہ دُوسری بار کُودنے تک دریا کی پہلی صورت قائم نہیں رہے گی۔ یونان کے قریباً تمام اوّلیں فلسفے پر زندگی کا یہ تاریک رُخ مسلّط ہے اور اِسی قنوطیت کی بنا پر ہریکلٹس کو آنسوؤں کا فلسفی کہا گیا۔ لیکن انسان فطرتاً پیہم تبدیل ہونے والی کائنات کے پس پُشت ایک ایسی لامحدود و لازوال قوت کا بھی طالب ہے، جس میں اَبدیت کے سارے عناصر موجود ہوں۔ چنانچہ اِس دَور کے یونانی فلسفے میں بھی اِس لامحدود قوت کو دریافت کرنے کی ایک واضح سعی کارفرما نظر آتی ہے۔

افلاطون نے جہاں ہریکلٹس کی یہ بات مان لی کہ کائنات کی ہر چیز پیہم تبدیلی سے ہم کنار ہے، وہاں اُس نے یہ قیمتی اضافہ بھی کیا کہ دراصل ہمارے تجربات کی وُہ دُنیا، جس کا ہم اپنے حواسِ خمسہ سے اِدراک کرتے ہیں، پیہم تبدیل ہونے والی غیر حقیقی دُنیا ہے، نیز اِس کے علاوہ بھی ایک دُنیا ہے جس کا اِدراک صرف ذہنی طور پر ہی کیا جا سکتا ہے...... اِس دُنیا کی اَشیا حقیقی ہیں!

افلاطون کے مطابق "تخیل" ہی اصل چیز ہے: ورنہ وُہ اشیا جنھیں ہم حقیقی سمجھتے ہیں، دراصل تخیل کی نقول (copies) ہیں، بعینہٖ جس طرح پہاڑ کی تصویر دراصل پہاڑ نہیں، پہاڑ کی نقل ہوتی ہے۔ اُس کے نزدیک کسی چیز کا تخیل، دراصل اُس چیز کی وُہ خصوصیت ہے، جس کے بغیر اُس کا وُجود تسلیم کر لینا ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر زندگی اِن خصوصیات کا نام ہے نہ کہ اَشیا کا۔ چنانچہ حُسن ایک خصوصیت ہے جس کے معیار پر کائنات کی ہر خوبصورت چیز پہنچنے کے لیے کوشاں ہے۔ اِسی طرح "نیکی" ایک خوبی ہے اور افلاطون کی نظروں میں یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اِس کی جھلک دُنیا کے پاکیزہ اور بلند لوگوں کی زندگیوں میں ملتی ہے۔

ارسطو نے (کہ وہ افلاطون کا لائق شاگرد تھا) جہاں اپنے اُستاد کے بنیادی نظریات کو وضاحت سے پیش کیا، وہاں دُنیائے فلسفہ کو نئے نئے افکار سے بھی روشنی بہم پہنچائی۔ مثلاً ایک نیا نکتہ (جس پر اُس نے خاص طور سے زور دیا) یہ تھا کہ انسانی زندگی کا منتہا حصولِ مسرّت کے سوا کچھ نہیں۔ کسی چیز کی

سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وُہ زیادہ سے زیادہ مسرت مہیا کرے۔ اس کے برعکس ہر وُہ چیز بُری ہے جس سے مسرت کا حصول ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں ارسطو نے زندگی کو تین صُورتوں میں پیش کیا ہے۔ پہلی صورت وہ ہے جس میں احساس کا وُجود ہے لیکن حرکت کا وُجود بالکل نہیں...... مثلاً نباتات۔ دُوسری صورت میں حیوانات شامل ہیں جو محسوس بھی کرتے ہیں اور حرکت بھی کرتے ہیں۔ تیسری صورت انسان کی مظہر ہے جو محسوس کرنے اور حرکت کرنے کے علاوہ سوچ بچار بھی کر سکتا ہے...... سوچنے کی خصوصیت صرف انسان ہی کو ارزانی ہُوئی ہے اور یہی خصوصیت اُسے نباتات اور حیوانات سے متمیز بھی کرتی ہے۔ اب چونکہ انسان کو اسی امتیازی خصوصیت یعنی فہم و ادراک نے آغازِ کار ہی میں نباتات اور حیوانات پر غالب آنے کی قوت عطا کر دی ہے' لہٰذا قیاس اغلب ہے کہ اس خصوصیت کا ارتقا اور نکھار اُسے مسرت اور سکونِ قلب عطا کرنے میں بھی نمایاں طور سے کامیاب ہو جائے گا۔ دراصل ارسطو کہنا یہ چاہتا ہے کہ انسان کی مسرت کا تمام تر دارومدار اُس کی ذہنی کاوشوں پر ہے اُس کے جذبات و احساسات پر ہرگز نہیں: لہٰذا مسرت کے حصُول کے لیے انسان کو چاہیے کہ وہ جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ دے اور محض ذہنی ارتقا کو اپنا مطمحِ نظر بنائے!

ارسطو نے عقل اور جذبے کے مابین جو تفریق پیدا کی اور جس طرح عقل کے مقابل عشق یا جذبے کو کم تریں بلکہ گردن زدنی قرار دیا' وہ اُس بحث کا آغاز ثابت ہوئی جو مغربی فلسفے کی قریباً ساری تاریخ پر مسلط ہے۔ اس بحث کے طفیل (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) کبھی تو مفکرین کا ایک ایسا گروہ پیدا ہُوا جس نے ہر شے کو محض عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی اور کبھی کسی گروہ نے محض جذبے کو سراہا اور عقلی منطق کو سراسر غلط راستہ قرار دیا۔ غور کیا جائے تو دورِ جدید میں فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث دراصل سلسلۂ فکر کے اسی تضاد کی ایک صورت ہے جو ہمیشہ سے مغربی فلسفے کی تاریخ پر مسلط رہا ہے۔

ارسطو یونانی فلسفے کے بتدریج بلند ہوتے سلسلہ ہائے کوہ کی آخری چوٹی تھا جس کے بعد اس پُراسرار سرزمیں یعنی یونان کو کبھی رُوحانی عظمت نصیب نہیں ہو سکی۔ تاہم ارسطو کے فوراً بعد یہ زوال شروع نہیں ہوا۔ زینو (Zeno) اور اپی کیورس (Epicurus) نے یونانی فلسفے کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو چندے مزید جلائے رکھا اور زندگی سے متعلق دو ایسے مختلف اور متضاد نظریے پیش کیے جو بعد ازاں ایک طویل کشمکش کا باعث ثابت ہوئے۔ ان میں سے زینو کا نظریہ تو صریحاً شکست کی آواز تھا

.... اُس کے مطابق اِنسان کا فرض یہ نہیں کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے تگ و دو کرتا پھرے اور زندگی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے' اُس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی موجود زندگی پر قانع رہے اور اپنی خواہشات کے پاؤں کو چادر کے مطابق ہی پھیلائے!

اِس کے برعکس اپی کیورس ایسی شکست خوردہ زندگی کا قائل نہیں تھا اور مسرت کے لیے تگ و دو ہی کو زندگی کا آخری منتہا سمجھتا تھا۔ اُس کی نظروں میں مسرت وہ نہیں جو جسمانی لذت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے کیونکہ ایسی مسرت رُوح کو بے چین کر دیتی ہے' وہ مسرت اُسے قرار دیتا ہے جو اِنسان کی ذہنی آسودگی کا باعث بنتے ہوئے اُسے سکون اور شانتی سے قریب تر کر دے۔

رُومیوں نے جب ۱۴۶ قبل از مسیح میں یونان پر حملہ کیا تو دیکھا کہ یہ دونوں مدرسہ ہائے فکر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ واپس لوٹے تو (جیسا کہ فاتح کا قاعدہ ہوتا ہے) اِن دونوں نظریوں کو اپنے ساتھ رُوم لے آئے۔ بعد اَزاں رُوم نے جو تھوڑا بہت فلسفہ پیش کیا' وہ اِنھیں نظریوں کے تصادم کی تصویر تھا۔

سلطنتِ رُوم کے خاتمے کے بعد قریباً ایک ہزار سال کا عرصہ فلسفے کی تاریخ میں تاریکی کا زمانہ ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب کلیسا کی طاقت روز بروز بڑھتے چلی گئی۔ ایک سلطنت کے بعد دُوسری سلطنت اور ایک ملک کے بعد دُوسرا ملک کلیسا کے تحت آتے چلا گیا' حتیٰ کہ یورپ کا بڑا حصہ رُوحانی اور جسمانی طور پر اُس کے بے رحم پنجوں کا اَسیر ہو کر رہ گیا۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں تو یورپ کا قریباً ایک تہائی حصہ کلیسا کے قبضے میں آ چکا تھا اور زندگی ایک تاریک خول بن کر رہ گئی تھی۔

تاہم اِس سب کا رَدِّعمل بھی ضروری تھا اور یہ رَدِّعمل ایک پُراسرار طریق سے ہُوا۔ یکایک زمین کی زرخیزی بڑھ گئی اور اِس زرخیزی کے ساتھ ہی اِنسانی ذہن بھی یک لخت زرخیز ہو گیا۔ جرمنی سے ایک آواز اُٹھی اور اِس آواز نے گویا کلیسا کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا...... یہ صرف ایک شخص کی آواز نہیں تھی' یورپ بحیثیتِ مجموعی تاریکی کی سنگین دیواروں کو توڑ کر باہر نکل رہا تھا۔ پریس اور صلیبی جنگوں نے ذہنی آفاق کو وسیع کرنے میں مدد بہم پہنچائی اور اِحیاءُ العلوم (Renaissance) کی ایک ہی برقی لہر نے سارے یورپ کو جھٹک کر بیدار کر دیا۔

اِسی زمانے سے فلسفے کے دورِ جدید کا آغاز ہُوا اور اِس کی پہلی آواز اِنگلستان کے ایک شخص نے بلند کی جس کا نام فرانسس بیکن (Francis Bacon) تھا۔ اُس نے زندگی کے تمام معمولات کو حل کرنے

کے لیے سائنس اور منطق کا سہارا لیا اور یوں ایک ایسے سلسلۂ فکر کی بنیاد رکھی جس نے عقل و فہم پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اور عملی میدان میں ذاتی مشاہدے اور تجربے کے معیار مقرر کرکے تاریکیوں کو چیرنے کی سعیِ جمیل کی۔ بیکن، ڈیکارٹ، سپائی نوزا، والٹیئر، لاک اور ہیوم اسی سلسلۂ فکر کی مختلف آوازیں تھیں۔

بیکن نے جہالت کو غم اور دکھ کا موجب قرار دیتے ہوئے تحصیلِ علم پر زور دیا اور کہا کہ مسرت، اشیا کی ماہیت دریافت کرنے ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ جہاں زمانۂ قدیم میں فلسفے کا مقصد بدلتی ہوئی زندگی کے پس پشت ایک لازوال اور غیر مرئی ہستی کی دریافت تھا، وہاں فرانسس بیکن کے ساتھ فلسفہ شک شبہے کے میدان میں داخل ہوا اور منطق اور سائنس کے ذریعے اور عقل و خرد کی روشنی میں، ہر چیز کی ماہیت دریافت کرنے کے نمایاں رجحانات پیدا ہو گئے۔

بیکن کی طرح ڈیکارٹ (Descartes) نے بھی اپنے فلسفے کا آغاز شک شبہے سے کیا۔ اس کے شک شبہے نے تو اس قدر وسعت اختیار کر لی کہ کائنات کی ہر شے اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ البتہ وہ اپنی ہستی پر شبہ نہ کر سکا اور اس بات کا اظہار اس نے اپنے مشہور مقولے میں کر بھی دیا:

> میں سوچتا ہوں، لہٰذا میں موجود ہوں!

اور اسی بنیاد سے اس نے کائنات کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ کائنات جس کا وجود انسانی ذہن کا رہینِ منت ہے، وہ کائنات نہیں جس کا ادراک ہم اپنے حواسِ خمسہ سے کرتے ہیں کیونکہ حواسِ خمسہ ہمیں دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔

ڈیکارٹ نے خدا کی ہستی کے علاوہ ذہن اور مادّے کے الگ الگ وجود بھی تسلیم کیے اور ان کے ایک دوسرے پر اثرات واضح کرنے کی سعی بھی کی: لیکن بات بن نہ سکی۔

ڈیکارٹ کے بعد یہودی فلسفی سپائی نوزا (Spinoza) نے (جسے اس کے عجیب و غریب نظریات کی بنا پر یہودیت سے خارج کر دیا گیا تھا) مادّے اور ذہن کو الگ الگ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے مطابق کائنات میں صرف ایک ہی ہستی کا وجود تھا: مادہ اور ذہن، محض اس کی خصوصیات تھیں:

> ہر چیز خدا کی مظہر ہے اور اس کی ہستی کے اندر رہتے ہوئے حرکت کرتی ہے ...... جو نسبت دائرے کے قانون کو تمام دائروں سے ہے، وہی نسبت خدا کو اس کی کائنات سے ہے...... سب سے بڑی مسرت اس بات میں ہے کہ ذہن اور کائنات کے ازلی و ابدی ملاپ کا علم حاصل کیا جائے!

ان نظریات کی بدولت سپائی نوزا اپنے ہم عصر فلاسفہ سے بہت بلند نظر آتا ہے اور بعض

مقامات پر تو وہ ویدانت اور تصوّف کے عظیم نظریات کے بہت قریب پہنچ جاتا ہے؛ لیکن بنیادی طور پر وہ محض ایک فلسفی ہے جس نے ذہن کی قوتوں سے کائنات کے معمّے کو حل کرنے کی سعی کی۔ وہ اپنے احساسات کو کائنات کی لامحدودیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کرتا...... اُس کے نظریات کی تمام تر اَساس فہم و ادراک پر اُستوار ہے' احساس اور تجربے پر نہیں۔ بہرحال سپائی نوزا بھی مسرّت کو ہر کاوش کی منزل قرار دیتا ہے اور مسرّت کی توضیح اِس طرح کرتا ہے:

> یہ ایک کیفیت ہے جو اِنسان کو تکمیل کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔

اِس کے برعکس جب وہ تکمیل کے کسی مقام سے نیچے گرتا ہے تو اُسے غم محسوس ہوتا ہے۔ اُس کے مطابق:

> ہر طبعی رُجحان فرد کی بقا کا ضامن ہے: اور طبعی رُجحان کی تسکین ہو جائے تو فرد لطف محسوس کرتا ہے' اور یہ تشنہ رہ جائے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ہم اشیا کی خواہش اِس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں اُن سے لطف حاصل ہوتا ہے: چونکہ ہم اُن کی خواہش کرتے ہیں' لہٰذا وہ ہمیں مسرّت بہم پہنچاتی ہیں اور ہم اُن کی خواہش اِس لیے کرتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں!

لیکن یہ مجبوری کیوں...... سپائی نوزا حصولِ مسرّت کے لیے اِنسان کو طبعی رُجحانات اور خواہشات سے بلند ہو جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اُس کے پاس اعلیٰ اِنسان (Superman) کا تصوّر یہ ہے کہ وہ ہر خواہش سے بلند ہوتے ہوئے' خود پر پُوری طرح سے قادر ہو..... صرف ایسی صورت میں وہ صحیح مسرّت سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر سپائی نوزا نے بیکن اور ڈیکارٹ کے نظریات کو وسعت بخش کر' تمام کائنات کو ریاضی کے اَزلی و اَبدی قوانین کا ایک نمونہ ثابت کیا اور اُسے سمجھنے کے لیے علم و خرد کا دامن تھام لینے کی نمایاں طور پر ترغیب دی۔

سپائی نوزا کے بعد والٹیر' لاک (Locke)' ہابز (Hobbes) اور دُوسرے فلاسفہ نے خرد کی روشنی کو تیز کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اور مادّہ پرستی پروان چڑھتی رہی۔

ہر چند کہ جان لاک نے اِس عام سطح سے ذرا بلند ہونے کی کوشش کی اور خرد کے وسیلے کو زیرِ بحث لا کر' فلسفے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اِضافہ کر دیا: تاہم مجموعی طور پر مادّہ پرستی کا عالم قائم رہا۔ لاک نے اِنسانی ذہن کو ایک سپید کاغذ سے تشبیہ دی' جس پر تجربات اَثر انداز ہوتے ہیں' حسیات کے نقوش اُبھرتے ہیں' قوتِ یادداشت بیدار ہوتی ہے اور خیالات معرضِ وجود میں آنے لگتے ہیں:

> ہمارا علم صرف ہمارے حواسِ خمسہ کا مرہون ہے۔ چونکہ صرف مادّی اشیا ہی حواسِ خمسہ پر اثر انداز

> ہو کر ہمارے ذہن کی تشکیل میں مدد بہم پہنچاتی ہیں' لہٰذا کائنات میں سوائے مادّے کے اَور کسی چیز کا وُجود نہیں۔

لیکن یہ غلط ہے!...... پادری برکلے بے اختیار پکار اُٹھا:

> اس سے یہ کہاں ثابت ہُوا کہ زندگی مادّے کے سوا اَور کچھ نہیں۔ اس سے تو یہ ثابت ہُوا کہ مادّے کا علم ہمارے حواسِ خمسہ کا رہینِ منت ہے' لہٰذا اگر مادّے کا وُجود ہے تو صرف ہمارے ذہن میں ہے۔

برکلے کی منطق بڑی غیر معمولی تھی: اُس نے تمام کائنات کو خُدا کے ذہن میں ایک "خیال" قرار دیتے ہوئے' مادّہ پرستی پر کاری ضرب لگانے کی سعی کی۔ لیکن ڈیوڈ ہیوم (David Hume) نے صرف چھبیس "۲۶" برس کی عمر میں برکلے کے سارے فلسفے کو ایک ہی وار میں مٹا کر رکھ دیا۔ اُس نے کہا:

> ذہن تو محض نام ہے خیالات کے تسلسل کا۔ ہمارا مشاہدہ' یادداشت اَور احساس' ہمارے ذہن میں نہیں' یہ خود ہمارا ذہن ہیں۔ خیالات کے پسِ پشت رُوح کا وُجود مضحکہ خیز ہے۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ جس طرح برکلے نے مادّے کے وُجود کو ختم کر دیا تھا' اسی طرح ہیوم نے ذہن کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا' اَور مغربی فلسفے کا وہ قصر' جسے بیکن اَور ڈیکارٹ نے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا تھا' ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔

یہاں پہنچ کر مغربی ذہن نے ایک نمایاں کروٹ لی اَور فلسفے کے اُفق پر ایک دُبلے پتلے فرانسیسی فلسفی کے نقوش واضح ہونا شروع ہو گئے...... یہ ژین جیکوئز روسو (Jean Jacques Ruusseau) تھا جو مادّہ پرستی اَور عقل و منطق کے تسلّط کے خلاف ردِعمل کی علامت تھا۔ اُس کی دانست میں ہر شے کو محض عقل و منطق کی ترازو پر تول کر اُس کی ماہیت پر حکم لگانا درست نہیں تھا کہ زندگی میں ایسے لاینحل اَور مشکل مسائل بھی ہیں جنھیں انسان کے طبعی رجحانات اَور اُس کے جذبات و احساسات کی غیر شعوری قوتیں ہی حل کر سکتی ہیں۔ روسو نے دُنیا کو صاف اَور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ:

> محض عقل و منطق پر ہر لحظہ بڑھتا ہُوا اعتماد درست نہیں' نیز اِس کے مقابل انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ دل کی دُنیا کو وسعت بخشنے کی کوشش کرے۔

روسو کے مطابق:

> اگرچہ عقلی طور پر خُدا کے وُجود کو تسلیم کرنا مشکل ہے لیکن چونکہ ہمارا دل خُدا کے وُجود کا پُوری طرح قائل ہے' لہٰذا کیوں نہ انسانی عقل کے مقابل' انسان کے احساس و جذبے پر یقین کامل رکھتے ہوئے' خُدا کے وُجود کو تسلیم کر لیا جائے!

روسو نے جب اپنے انقلابی خیالات کی کتاب، جس کے مطابق انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے طبعی رُجحانات کی دُنیا کو لوٹ جائے' بوڑھے والٹیر کی خدمت میں بھیجی تو اُس نے جواب میں لکھا:

> جنابِ من! حضرتِ انسان کے خلاف لکھی ہوئی آپ کی کتاب مجھے ملی، شکریہ! آپ نے بڑے سلیقے سے ہمیں حیوانوں کے زُمرے میں شامل ہو جانے کی دعوت دی ہے۔ آپ کی کتاب پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ فوراً چوپایوں کے بَل چلنا شروع کر دیا جائے۔ لیکن افسوس کہ پچھلے ساٹھ برس سے صرف ٹانگیں استعمال کر رہا ہوں۔ اب اس پیرانہ سالی میں بچپن کی عادات کیسے قبول کر سکتا ہوں!

لیکن جرمن فلسفی کانٹ (Kant) تک جب روسو کی نئی کتاب پہنچی تو اُسے اپنی روزانہ چہل قدمی کا بھی خیال نہ رہا اور اُس نے ایک ہی نشست میں ساری کتاب پڑھ ڈالی۔ کانٹ کے لیے یہ ایک نیا احساسی تجربہ تھا کہ دُنیا کے کسی گوشے میں کوئی اور دل بھی اُسی کے دل کی تال پر دھڑک رہا تھا۔ چنانچہ کانٹ کے فلسفے نے روسو کے خیالات سے ایک نئی تحریک حاصل کی۔

سب سے پہلے تو کانٹ نے اس بات سے اِنکار کیا کہ ہمارا ذہن محض موم کی ایک تختی ہے جس پر حسیات و تجربات اپنے نقوش اُبھارتے ہیں۔

> علم محض حسیات و تجربات کا رہینِ منت نہیں، یہ اُن سے ماورا بھی ہے۔

کانٹ نے انسانی ذہن کو اُس جرنیل سے تشبیہ دی ہے جو میدانِ جنگ میں کھڑا ہو اور حسیات و تجربات کی بے ترتیب لہروں کو وُہ پیغامات کہا جو میدانِ جنگ کے مختلف حصّوں سے اُس تک پہنچ رہے ہوں۔ ... یہ پیغامات اَز خود ہی جرنیل کے آخری حکم کی صورت اختیار نہیں کر جاتے؛ واقعہ یہ ہے کہ جرنیل اِن اُلجھے ہوئے پیغامات کو سلجھا کر ایک نتیجے پر پہنچتا ہے اور آخری حکم جاری کرتا ہے۔ پس کانٹ کے مطابق:

> حسیات و تجربات کو سلجھانا' ہمارے ذہن کی ایک "عقلی قوت" کا کرشمہ ہے اور یہ اُس قوت کا ایک نمایاں مقصد (Purpose of Mind) ہے جو کائنات کو تنظیم سے ہمکنار کرتا ہے ورنہ کائنات کی اَشیا کا اَز خود ایک سلسلۂ تنظیم میں منسلک ہو جانا محلِ نظر ہے۔

مختصر اَلفاظ میں کانٹ کے فلسفے کا لُبِ لباب یہ ہے کہ ہمارا ذہن محض ہماری حسیات کا مرہُونِ نہیں، یہ تو ایک ایسی طاقت ہے جو حسیات و تجربات کو سلجھانے اور منظم کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔ کانٹ نے ذہن کی اِس "عقلی قوت" کو بڑی اَہمیت دی ہے۔ وُہ اُن اَعمال کو نیک متصور نہیں کرتا جو

واقعۃً اچھے ہوتے ہیں وُہ صرف اُنھیں اچھا سمجھتا ہے جن کے لیے ہمارا ضمیر ہمیں اُبھارتا ہے۔ اُس کے مطابق دُنیا میں بہترین بات یہی ہے کہ ضمیر کی آواز پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا جائے۔ اُس نے شخصی یا ذاتی مسرت کو ثانوی حیثیت دی ہے اور کہا ہے کہ فرد کو چاہیے کہ وہ دُوسروں کی مسرت کو پیشِ نظر رکھے۔ لیکن جہاں تک اُس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، اُس کے پیشِ نظر صرف اپنی تکمیل اور ارتقا ہے، چاہے اِس عمل سے اُسے مسرت ارزانی ہو یا نہ ہو۔

مسرت کے اِس سوال پر کانٹ کے ہم عصر بینتھم (J. Benthem) کا نظریہ بھی قابلِ فکر ہے۔ بینتھم کے مطابق اجتماعی مسرت، ہر حال میں مقدم ہے اور اعمال کا نیک یا بد ہونا صرف اِس بات پر منحصر ہے کہ وُہ کہاں تک کم یا زیادہ مسرت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ تھیوری اخلاق اور انصاف پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اعمال کا منتہا صرف زیادہ سے زیادہ مسرت کا حصُول نہیں ہوتا، وہ بعض دیگر اقدار کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص، جس کے پاس آپ کی کچھ رقم بطورِ امانت پڑی ہے، آپ کو واپس کرنے سے اِنکار کر دے اور یہ کہ کر اُسے لوگوں میں تقسیم کر دے کہ اِس سے اجتماعی مسرت میں اضافہ ہوگا...... اِس سے سوسائٹی کی بنیادوں کے متزلزل ہو جانے کا خطرہ ہے۔

مسرت کے اِس سوال کو جان سٹوارٹ مل (John Stuart Mill) نے بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کی دانست میں صرف زیادہ سے زیادہ مسرت کا حصُول اِنسانی اعمال کا منتہا نہیں ہونا چاہیے۔ اِس کے بجائے اِنسان کا فرض یہ ہے کہ وُہ چاہے کم مسرت حاصل کرے لیکن اِس مسرت کا معیار خاصا بلند ہو۔

مجموعی طور پر کانٹ نے خرد پر اعتراض کر کے اور احساس کو اہمیت دے کر وہ راستہ صاف کر دیا جس پر ہیگل اور شوپن ہار اور نطشے اور برگساں نے سفر کر کے فلسفے کی نئی نئی پگڈنڈیاں دریافت کیں۔ اِن میں سے ہیگل (Hegel) تحرک اور حرکت کا علَم بردار تھا۔ اُس کی دانست میں کشمکش ہی اِرتقا کے مختلف مدارج کی ضامن تھی اور زندگی کا منتہا مسرت نہیں، تحصیل اور فتح (Achievement) تھا:

> دُنیا کی تاریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ مسرت، امن اور خوشحالی کے ادوار، تاریخی اعتبار سے جمود کے ادوار ہیں اور یہ چیز اِنسان کی شان کے منافی ہے۔

ہیگل مزید کہتا ہے:

> تضاد اور تفریق ہر جگہ نمایاں ہے اور انسانی ذہن اور فلسفے کا کام اس تضاد اور تفریق کے پس پشت تنظیم اور یکتائی کی دریافت ہے۔ اسی طرح مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس کُل کا احساس و ادراک کرے جس میں تضاد اور تفریق کے تمام مظاہر متحد ہو کر ایک ہو جاتے ہیں اور ذہن و مادہ فاعل و مفعول اور نیک و بد میں قطعاً کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا، روسو کے ساتھ فلسفے کا وہ دور شروع ہو گیا تھا جس میں خرد کے مقابل احساس کو زیادہ وقعت مل رہی تھی...... اس سلسلے میں کانٹ نے ذہن کی "مخفی قوت" کا نام لیا تھا جو ذہنی استدلال سے ماورا تھی اور جو حسیات و تجربات کو از خود سلجھاتے اور منظم کرتے چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد اگلا قدم شوپن ہار (Schopenhauer) نے اُٹھایا جب اُس نے اس بات کا اظہار کیا:

> ہم کسی چیز کی خواہش اس لیے نہیں کرتے کہ اس خواہش کے جواز میں چند دلائل پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں: ہم چونکہ کسی چیز کی خواہش کرتے ہیں، لہٰذا اس خواہش کے جواز میں پہلے خود ہی دلائل پیدا کر لیتے ہیں۔

بڑی چیز وہ خواہش ہے جسے شوپن ہار نے خواہشِ مجہول (Un-conscious Will) کا نام دیا ہے اور جو سارے انسانی افعال و اعمال کے پس پشت سرگرم ہے۔ اس کے خیال میں انسانی اعمال، انسان کے ذہن کے نہیں، دل کے تابع ہیں۔

انسان کیا ہے...... خواہش کا آلۂ کار...... وہ خواہش جس کی کبھی تسکین نہیں ہو سکی...... جب تک وہ خواہش کے اشاروں پر ناچتا رہے گا، اُسے کبھی اَبدی مسرت حاصل نہیں ہو سکے گی۔ انسان کا یہ خیال غلط ہے کہ خواہش کی تسکین سے اُسے مسرت حاصل ہو جائے گی...... یہ اس لیے کہ ہر خواہش دراصل سینکڑوں دوسری خواہشات کو کروٹ دیتے چلے جاتی ہے۔ مجموعی طور پر انسانی خواہش ایک پیاسی خواہش ہے جو کبھی سیراب نہیں ہوئی۔

شوپن ہار نے مسرت کو منفی قرار دیا ہے۔ اس کی دانست میں مسرت، غم کے فقدان کا نام ہے، اور اصل چیز غم ہے جو مثبت ہے اور جو انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ واضح ہوتے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص جتنا حساس ہو گا، اُتنا ہی غم کا اور اُس کا چولی دامن کا ساتھ ہو جائے گا: "وہ جو علم میں اضافہ کرتا ہے، دراصل غم میں اضافہ کرتا ہے۔" دُنیا کی کوئی چیز اس قابل نہیں کہ اُسے حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کی جائے۔ یہاں ہر چیز فضول ہے، بے کار اور بے مصرف ہے...... محبت، رفاقت، وطن پرستی سب کچھ فریب ہے۔ صرف وہی شخص یہاں خوش رہ سکتا ہے جو نوجوان کی طرح جاہل ہو...... نوجوان سمجھتا

ہے کہ خواہش کرتے چلے جانا ہی مسرّت ہے؛ وہ نہیں جانتا کہ خواہش کے خاتمے پر حقیقت کا آسیب بھی رہتا ہے، اُسے ابھی شکست کا احساس نہیں ہوا۔

شوپن ہار کے مطابق:

> خود کشی ہی اِنسان کا آخری سہارا ہے...... یوں اِنسان کی ذہنی قوتوں کو اُس کے طبعی رُجحان پر فتح حاصل ہوتی ہے؛ لیکن یہ فتح اِنفرادی نوعیت کی ہے اَور فرد کی موت کے بعد بھی دُوسرے اَفراد میں زندہ رہنے کی خواہش متحرک رہتی ہے۔

بقولِ شوپن ہار:

> زندگی کے مصائب پر کبھی پُوری فتح حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ خواہش کو ذہنی قوتوں کے تابع نہ کر دیا جائے۔

البتہ شوپن ہار نے آرٹ کو بہت سراہا ہے اَور کہا ہے:

> آرٹ ہمیں اِنفرادیت سے بلند کر کے اَور مادّی اَور جسمانی خواہشات سے اُوپر اُٹھا کر، سچائی کی دریافت کی طرف مائل کرتا ہے۔ آرٹ اَور سائنس میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ سائنس مادّی حقائق سے منزل کی طرف بڑھتی ہے، اَور آرٹ ایک ہی جست میں منزل پر جا پہنچتا ہے۔

چنانچہ سائنس کے لیے ایک اعلیٰ دماغ بھی کام دے سکتا ہے مگر آرٹ کے لیے خالص نابغہ ہستی (Genius) کی ضرورت ہوتی ہے۔ آرٹ تغیّر اَور اِنتشار کے پس پُشت اَبدیت کی جھلک دِکھا کر، ہمیں مکروہاتِ دُنیا سے آزاد کرتا ہے اَور یُوں ہماری مسرّت کا ایک بہت قریبی رفیق ثابت ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر شوپن ہار نے خواہش کو آلام و مصائب کا منبعِ اعظم قرار دیا اَور اِس سے آزادی حاصل کرنے کو اِنسان کا سب سے بڑا کارنامہ تسلیم کیا۔ اُسے بُدھ اِزم سے بڑا لگاؤ تھا اَور وہ نِروان یعنی خواہشات کے خاتمے کو بڑی اَہمیت دیتا تھا۔

شوپن ہار کا فلسفہ ایک نیوراتی اِنسان کا فلسفہ ہے۔ ویسے بھی شوپن ہار کی زندگی شروع سے آخر تک تنہائی سے ہم آہنگ رہی۔ اُس کی ماں نے اُس سے نفرت کی، ردِّ عمل کے طور پر اُس نے عورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُس کی کوئی بیوی نہ تھی؛ کوئی بچّہ نہ تھا؛ کوئی دوست، رفیق یا غم گسار نہ تھا؛ کوئی وطن یا ملک نہ تھا۔ وہ اَزل اَور اَبد کے مابین ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت کی طرح اکیلا کھڑا تھا۔ زندگی نے اُسے کچھ نہ دیا اَور اُس نے زندگی کے تمام رنگین پردے چاک کر ڈالے اَور لوگوں کے

سامنے دُنیا کی ایسی گھناؤنی اور مکروہ صورت پیش کی کہ دِل والوں نے آنکھیں بند کر لیں...... تو یہ تھا شوپن ہار...... زندگی کا زیرک ناظر لیکن بھٹکا ہُوا، ٹھکرایا ہُوا راہی!

شوپن ہار کہنے کو تو مر گیا لیکن اُس کا ازلی و ابدی غم کبھی نہ مر سکا۔ اُس نے زندگی کی جو بھیانک تصویر پیش کی وُہ کبھی مِٹ نہ سکی۔ بعد ازاں جس کسی نے بھی اُس کے زاویے سے حیات کا نظارہ کیا، اُس کے مُنہ سے ایک دِل دوز چیخ ضرور نکل گئی اور وُہ پھر کبھی پُوری طرح سنبھل نہ سکا۔

نطشے (Nietzche)، وہ "مجذوبِ فرنگی" جسے اقبال بیسویں صدی میں "مقامِ کبریا" دِکھانا چاہتا تھا، غالباً پہلا شخص تھا جو شوپن ہار کے فلسفے سے شدید طور پر متاثر ہُوا۔ اگرچہ اُس نے جلد ہی اپنے لیے ایک نئی شاہراہ دریافت کر لی؛ لیکن وہ غم جو ایک بار اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا، پھر کبھی اُس سے جُدا نہ ہو سکا۔ نطشے پر آخر دم تک غم کے دُھندلکے چھائے رہے۔

لیکن نطشے کا فلسفہ محض شوپن ہار کے خیالات کا چربہ نہیں تھا۔ ایک عرصے سے وُہ مواد اِکٹھا ہو رہا تھا جسے ایک روز وسوویس کی چوٹی سے پھٹ کر بہہ نکلنا تھا: اِس مواد کی تعمیر میں کانٹ کی "ذہن کی تخلیقی قوت"، ہیگل کے "تحرک اور اِنقلاب"، شوپن ہار کی "غیر شعوری خواہش" اور ڈارون کی "جہد للبقا اور بقائے بہترین" نے نمایاں طور پر حصہ لیا تھا اور اب یہ تمام نظریے نطشے کے دماغ میں غیر شعوری طور سے ایک نئے فلسفۂ حیات کی صورت اِختیار کر رہے تھے جبکہ وہ خود زندگی کے ہنگاموں سے بہت دُور کوہِ ایلپس کی بلندیوں پر بیٹھا تھا۔

اور پھر یکایک آتش فشاں کا دہانہ پھٹ پڑا اور نطشے کی زبان سے شاعری اور فلسفے کا ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر بہہ نکلا۔ کتاب مکمل ہو گئی: خود نطشے بھی جانتا تھا کہ یہ اُس کی زندگی کا شاہکار تھا۔ اِس کے بعد اُسے جو کچھ بھی لکھنا تھا، وہ محض اُس کتاب کا ضمیمہ ثابت ہونے والا تھا۔ لیکن جب یہ کتاب چھپ کر منظرِ عام پر آئی تو اِس کے صرف پینتالیس ۴۵ نسخے بِک سکے۔ سات نسخے تحفۃً بھیجے گئے۔ صرف ایک شخص نے کتاب کی رسید سے مطلع کیا۔ کسی نے تعریف کا ایک لفظ تک مُنہ سے نہ نکالا۔

نطشے کے مطابق:

> مسرت پر ہم اِنسانوں کا کوئی حق نہیں...... یہ صرف اعلیٰ اِنسان (Superman) ہی کو ارزانی ہو سکتی ہے۔ ہمارا کام فقط اِس قدر ہے کہ کام کرتے چلے جائیں اور یا تو خود اعلیٰ اِنسان بن جائیں یا اعلیٰ اِنسان کے غلام بن کر اُس کے اِشاروں پر ناچتے رہیں۔

نطشے کا اعلیٰ اِنسان قوت، جواں مردی اور خودداری کا مظہر ہے۔ چونکہ اِن خصوصیات کا اِرتقا جنگ اَو انقلاب کا طالب ہے اِس لیے اعلیٰ اِنسان کی تخلیق کے لیے وہ جنگ کو بھی قابلِ تحسین چیز سمجھتے ہوئے کہتا ہے کہ سب سے بڑی خصوصیت بہادری ہے! اِس لیے ہر وہ چیز جو احساسِ قوت کو بڑھاتی ہے اچھی ہے!

نطشے کی دانست میں اِجتماعی مسرت، اِجتماعی اِرتقا بے معنی چیزیں ہیں بلکہ وُہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ:

> اِنسان کا تصور بذاتِ خود مضحکہ خیز ہے۔ زندگی افراد کا نام ہے اور ہر فرد اپنی ایک الگ شخصیت رکھتا ہے۔ اِنسانی مساعی کا کام یہ نہیں کہ اِجتماعی مسرت میں اِضافہ ہو، اِن مساعی کا کام یہ ہے کہ فرد کا معیار بلند کیا جائے۔

وہ محبت کی شادی کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ شادی صرف "بہترین" کے مابین ہونی چاہیے۔ نطشے بُرائی اَو بے رحمی کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ وُہ کہتا ہے:

> اِن چیزوں کا وُجود ہی اِس بات پر دال ہے کہ یہ اِنسان کے لیے اَز بس ضروری ہیں...... اِس لیے بھی کہ اِنسان اِن سے بے اندازہ مسرت حاصل کرتا ہے۔

اِنسان کا بشکلِ قتل، ٹریجڈی اَو بے رحمی کے دیگر مظاہر سے مسرت حاصل کرنا، نطشے کے اِس رُجحان کی کافی غمازی کرتا ہے۔

نطشے نے قوت، بے خوفی اور جرأت کی جس طرح پرستش کی ہے اور اعلیٰ اِنسان کا جو تصور پیش کیا ہے اُس سے معاً خیال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کا مردِ مومن بھی قریب قریب اِنھیں خصوصیات کا حامل ہے...... کیا یہ تو نہیں کہ اقبال اِس سلسلے میں نطشے سے متاثر ہو گیا ہو! میری دانست میں اِس کا جواب "ہاں" بھی ہے اور "نہیں" بھی۔ "ہاں" اِس لیے کہ بنیادی طور پر نطشے کے اعلیٰ اِنسان اَو اقبال کے مردِ مومن میں بہت کم فرق ہے: دونوں خودداری، جرأت اَو طاقت کے دیوتا ہیں اَو دونوں کا کام افراد کو قعرِ مذلت سے اُٹھا کر بامِ ثریا تک پہنچانا ہے۔ اور "نہیں" اِس لیے کہ نطشے کا اعلیٰ اِنسان بہت سی باتوں میں اقبال کے مردِ مومن سے کمتر ہے۔ مثلاً نطشے کا اعلیٰ اِنسان طاقت اور جرأت کا تو مظہر ہے لیکن اُس میں وُہ قلندرانہ اور فقیرانہ شان نہیں جو اقبال کے مردِ مومن کو اَرزانی ہوئی ہے: اَو نہ ہی اُس کا ذہنی اُفق اِتنا وسیع ہے اَو نہ ہی اُس کی رُوحانی عظمت اِتنی واضح ہے۔

نطشے کے پیشِ نظر مادّی ارتقا ہے۔ اقبال کے پاس شاہین کا تصوّر ہے جو پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرتا ہے اور جس کے لیے کارِ آشیاں بندی' ذلّت کے سوا کچھ نہیں۔ پھر جہاں اقبال نطشے کا ہم نوا ہو کر کہتا ہے:

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اُور

جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب و فراز

وہاں وہ یہ کہہ کر نطشے سے بلند بھی ہو جاتا ہے:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ مَیں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے: بتا تیری رضا کیا ہے!

نطشے اُور اُنیسویں صدی کا ساتھ آخری دم تک رہا۔ اِدھر اُنیسویں صدی نے بیسویں صدی میں قدم رکھا اُدھر نطشے عالمِ جاودانی کو سدھار گیا۔ لیکن نطشے اُنیسویں صدی کے مقبول نظریات کا علم بردار نہیں تھا۔ اُنیسویں صدی کا زمانہ' دراصل زندگی کے ٹھوس مادّی نظریات کا زمانہ تھا۔ ڈاروِن نے غیر اِرادی طور پر اُور سپنسر (Spencer) نے اِرادۃً تمام کائنات کو مادّے کی ایک مشین میں تبدیل کر دیا تھا جہاں ہر حرکت کے پسِ پُشت ایک واضح تحریک موجود تھی اُور جہاں کوئی چیز بھی میکانکی عمل سے آزاد یا ماورا نہیں تھی۔ سماجی زندگی میں بھی یہ زمانہ' سائنس اُور مشین کے طفیل' ایک نئے نظامِ حیات کا زمانہ تھا جس میں صنعتی ترقی نے قدم جمانا شروع کر دیے تھے' اُور ایک نیا ذہنی اُور اِقتصادی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر مادّہ پرستی نے جلد ہی اِنسان کو ذہنی تہی دستی اُور کم مائیگی کا احساس دِلانا شروع کر دیا اُور اُس پر روز بروز واضح ہوتا گیا کہ وُہ تو محض مشین کا ایک پُرزہ ہے اُور مشین سے ہٹ کر اُس کی اپنی ہستی' نہ ہونے کے برابر ہے۔ احساسِ بقا کا یُوں بے دردی سے چِھن جانا' اِنسانی مسرت کے لیے ایک رُوح فرسا حادِثہ تھا۔

ایسے میں برگساں (Bergson) نے اِنسان کو مادّے کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے اپنی

مساعی کا آغاز کر دیا اور فلسفے کی تاریخ میں قریب قریب وہی کام انجام دیا جو والٹیر کے زمانے میں کانٹ نے انجام دیا تھا: یعنی محض ذہن کی دسترس سے انسانیت کو آزاد کروانے کی کوشش!

برگساں کی دانست میں زندگی حرکت اور تحرک کا دوسرا نام ہے اور اس کے مقابل مادہ جمود، بے حسی اور موت کا علم بردار ہے اور ہر قدم پر زندگی کی پرواز کو روکنے کی کوشش کرتا ہے...... تاہم زندگی ہار نہیں مانتی۔ اگرچہ اس کے بہت سے سپاہی اس معرکے میں کھیت ہو جاتے ہیں، مگر وہ پھر بھی دندناتے، گونجتے اور چنگھاڑتے ہوئے بڑھتے چلے جاتی ہے۔

آغازِ حیات میں زندگی مادے کی طرح بے حس تھی اور اسی طویل جمود اور بے حسی میں اسے سکون میسر تھا۔ بعد ازاں طبعی رجحانات کا سہارا لے کر زندگی ایک نئی راہ پر روانہ ہو گئی اور شہد کی مکھیوں کی سی تنظیم میں اسے سکونِ قلب حاصل ہونے لگا: لیکن اسے قرار کہاں؟ جلد ہی زندگی نے طبعی رجحانات کا لباس اتار پھینکا اور اس نے تخیل کی آزادہ روی سے مسرت حاصل کرنا شروع کر دی...... یہ زندگی کا ارتقا تھا...... طبعی رجحانات اب بھی موجود تھے اور اس کی مسرت کے ضامن بھی تھے لیکن فہم و تخیل کے طفیل زندگی کا افق بتدریج وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔

آج ہمارے سب اقدامات، ہماری طویل مساعی، ہماری امیدیں اور ارادے اس تحرک اور قوت کی بدولت ہیں جو زندگی کی صورت ہماری رگ رگ میں برقِ تپاں کی طرح دوڑ رہی ہے اور جس نے اس زمین کو بھی تحرک سے ہم کنار کر دیا ہے۔ اور کیا خبر کہ کسی روز زندگی کو چپکے سے اپنے دیرینہ دشمن یعنی مادے پر، جو ہمارے مسلسل کرب و الم، ہماری فنا اور تہی دستی کا موجب ہے، ایک زبردست فتح حاصل ہو جائے!

چاہیے تو یہ تھا کہ انیسویں صدی کا مادی نظریۂ حیات، سائنس کی روز افزوں ترقی کے طفیل، بیسویں صدی میں اپنی گرفت کو اور بھی مضبوط کر لیتا: لیکن ہوا یہ کہ جتنا مادے کا عمیق تجزیاتی مطالعہ ہوا، اتنا ہی مادے کی انیسویں صدی کی توضیح میں نمایاں انقلاب آتے چلا گیا۔ چنانچہ آئن سٹائن، سر جینز، ایچ لیوی، سر اڈنگٹن اور دوسرے سائنس دانوں نے ۔ ذرے کی قلیل ترین صورت یعنی ذرے (Atom) کو بہت جلد ٹھوس صورت سے محروم کر کے ایک سرابی کیفیت کا مظہر تسلیم کر لیا اور اسی حقیقت کو بنیاد قرار دے کر مادے کی ساری کائنات کو، جس کا ہم اپنے حواسِ خمسہ سے ادراک کرتے ہیں، غیر حقیقی قرار دے دیا۔ تاہم ان سائنس دانوں نے اس بات پر زور دیا کہ اس غیر حقیقی دنیا کے پس پشت "کچھ اور" بھی ہے کہ جس کا یہ عکس ہے۔ یہ "کچھ اور" کیا ہے...... سائنس اس کا جواب دینے سے قاصر ہے؛

لیکن قیاس اغلب ہے کہ جس طرح سائنس حُسن اور مزاح کے متعلق کچھ بتانے سے معذور ہے اسی طرح اس کی گرفت میں یہ "کچھ اور" بھی نہیں آسکتا۔ چنانچہ خیال ہے کہ وہ قوت کہ جس سے ہم حُسن اور مزاح کا اِدراک کرتے ہیں اُس سے ملتی جلتی قوت ہی سے کائنات کا اِدراک ممکن ہے۔

بیسویں صدی کے فلسفیاتی نظریات جہاں ایک طرف سائنس کی ترقی سے متاثر ہوئے وہاں دوسری طرف حیاتیات اور نفسیات کی جدید ترین تحقیقات نے بھی اُن پر بڑے واضح اثرات مرتسم کیے۔ حیاتیات نے یہ مسئلہ پیش کیا کہ سماجی اور ذہنی اِرتقا ایک ایسی زنجیر ہے جس کی ہر کڑی "نسل" نے مہیا کی ہے۔ چنانچہ نسل کی حاصل کی ہوئی خصوصیات طبعاً اور فطرتاً اگلی نسل میں منتقل ہوتے چلے آئی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ آج بیسویں صدی کا عام اِنسان پندرھویں صدی کے عام اِنسان سے ذہنی اور سماجی طور پر کافی بلند ہے اور علمی مسائل کو نسبتاً قلیل وقت میں سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح حیاتیات کے مطابق مسرّت ایک اِرتقائی کیفیت ہے اور یہ اِنسانی اِرتقا کے ساتھ ساتھ واضح ہوتے چلے گئی ہے۔ لہٰذا آج کا اِنسان اگلے زمانے کے اِنسان کی بہ نسبت فطرتاً زیادہ مسرّت حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے...... اس لیے کہ مسرّت ایک ذہنی کیفیت ہے اور جدید اِنسان اگلے زمانے کے اِنسان سے ذہنی طور پر کافی بلند ہے۔

موجودہ سائنس نے کائنات کو پُراسرار متصور کر کے اس کی حقیقت کو چیلنج کیا ہے اور یوں اِنسانی ذہن کو ایک عجیب قسم کی اُلجھن کے سپرد کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں سائنس نے اپنی اِنقلاب انگیز اِیجادات کے ذریعے زندگی کو ہنگامہ پرور بنا کر اِنسانی ذہن کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پُرانے ماحول سے کنارہ کش ہونے اور نئے ماحول کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف راغب کر دیا ہے اور یوں ذہن اور ماحول میں توازن کی ایک زبردست کمی پیدا کر کے جدید اِنسان کو ذہنی اِنتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ دوسری طرف حیاتیات نے زندگی کو ایک نمایاں ضابطہ (Pattern) مہیا کیا ہے اور مسرت کی آئندہ ممکنات کے دروازے کھول دیے ہیں۔ لیکن نفسیات نے پلٹ کر اِنسانی ذہن پر حملہ کیا ہے اور اِنسان کے بیشتر اِقدامات اُس کے مذہبی، سیاسی اور سماجی نظریات کو لاشعور کی پُراسرار تحریکات کے تابع کر دیا ہے۔ نفسیات کی خوردبین کے نیچے اِنسان آج ننگا ہو گیا ہے اور اُس کی حاصل کی ہوئی ساری شخصیت اور اِرتقا محض تند و تیز لاشعوری خواہشات کے دباؤ کا نتیجہ قرار پایا ہے۔ نفسیات نے اِنسانی فہم کو اُس آلے کی حیثیت دے دی ہے کہ خواہش جسے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے

استعمال کرتی ہے۔ بڑی چیز وہ لاشعوری خواہش ہے جس کے ہاتھوں میں ہم انسان محض کٹھ پتلیوں کی طرح کھیل رہے ہیں۔

نفسیات کے نظریات کو اگر سچ مان لیا جائے تو زندگی کی تمام ارتقائی کیفیات، یعنی آرٹ، مذہب، محبت اور روحانی تصورات کو (جن سے انسان بے اندازہ مسرت حاصل کرتا ہے)، اُن دبی ہوئی اَنہونی خواہشات اور طبعی رُجحانات کا نتیجہ گرداننا پڑے گا جن کے تند و تیز دھارے پر انسان، کاغذ کی ناؤ کی طرح بہتے چلا جا رہا ہے۔

نفسیات نے بیسویں صدی کے ذہنی اور سماجی ماحول پر جو اثرات مرتسم کیے ہیں، اُن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ قلیل سے قلیل وقت میں زیادہ سے زیادہ مسرت حاصل کرنے کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ لوگ جب اپنے کردار کی خود تشکیل کرنے سے قاصر ہیں، اور نہ تو اپنا مستقبل خود بنا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے ماضی کو بدل سکتے ہیں، تو وہ تھوڑے سے تھوڑے وقت میں زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف کیوں نہ اُٹھائیں کہ یوں "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مقولے پر عمل پیرا ہو کر، اپنی بے رحم فطرت سے انتقام لیا جا سکتا ہے!

پس اس میں کوئی کلام نہیں کہ بیسویں صدی میں نفسیات نے قریب قریب اُسی مادّی نظریۂ حیات کو تحریک دی ہے جو اُنیسویں صدی میں ڈارون اور سپنسر کے طفیل عام ہو گیا تھا۔ گویا نفسیات نے مسرت کے پھیلاؤ کو روک کر، اسے سمٹ جانے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے مغربی فلسفے کی تاریخ میں مسرت کا جائزہ لینے کی سعی کی ہے۔ آنے والے ادوار میں مسرت کو انسانی زندگی میں کیا مقام حاصل ہوگا، اس کی طرف ہم متوجہ نہیں ہو سکے...... شاید یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ آنے والے دور تاریکیوں سے ہم کنار ہیں اور ہم تاریکیوں کا سینہ چیرنے سے عاجز! پھر بھی پچھلے تجربات کی بنا پر آنے والے زمانے کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور کہا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم اس بات کو مدِ نظر رکھیں کہ کائنات کی لامحدودیت کے باعث یہاں کُل کا احساس و ادراک کرنے کے لیے ہمارے پاس جُزو کے سوا کچھ نہیں، اور اگر جُزو کا صحیح طور سے تجزیہ کیا جائے تو کُل کے متعلق حکم لگانا بھی بہت حد تک درست ہو سکتا ہے۔ اس مسئلے پر جدید سائنس کے نظریات بھی ہم سے متفق ہیں کہ وہ جوہر (Atom) کو اُن خصوصیات کا مظہر تسلیم کرتے ہیں جو کُل سے متعلق ہوتی ہیں۔ پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی قول ہے:

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ
اگر تم خدا (کُل) کو پہچاننا چاہتے ہو تو خود (جُزو) کو پہچانو!

پس آنے والے اَدوار میں مسرّت کا مقام معلوم کرنے کا اِرادہ ہو تو فرد کی زندگی کے مختلف اَدوار کا تجزیہ اور تاریخ کے اَدوار کے ساتھ اُن کی حیرت انگیز مناسبت کا مختصر سا جائزہ لینے کے بعد یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ہمارے ذہنی اور معاشرتی مسائل کی دُھندلی سی تصویر کیا ہوگی اور مسرّت کو ہماری زندگی میں کیا مقام حاصل ہوگا!

فی الحقیقت فرد کی زندگی اِنسانی تاریخ کے اَدوار کا ایک پُراسرار لیکن مختصر سا خاکہ ہے...... وہ یوں کہ فرد بچپن سے لے کر بڑھاپے تک جن مختلف کیفیات و تجربات سے گزرتا ہے بعینہٖ اُنھیں کیفیات و تجربات سے ساری اِنسانی تاریخ بھی گزری ہے۔ مثلاً فرد کے بچپن کے اوّلیں ایّام، اِنسانی تاریخ کے اُن ایّام سے شدید مماثلت رکھتے ہیں جب اِنسان محض طبعی رُجحانات کے اِشاروں پر سرگرم و متحرک تھا اور حیوانوں کے مانند جنگل کی زندگی بسر کرتا تھا۔ بعد اَزاں جب اُس نے چار ٹانگوں کے بجائے صرف دو ٹانگیں اِستعمال کرنا شروع کیں اور اُس کا سر بلند ہو کر اوّلیں ذہنی شعور سے آشنا ہوا تو وہ بچے کی زندگی کے اُس دَور میں داخل ہو گیا جب وہ رینگنے کے بجائے چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اَب اُس کی مسرّت محض طبعی رُجحانات کی مرہون نہیں تھی، اِس مسرّت پر فہم و شعور کی اوّلیں کرنیں بھی اَثر انداز ہونے لگ گئی تھیں۔ یہی وہ دَور تھا جب اِنسان بچے کی طرح پہلی بار سوسائٹی کے قواعد و ضوابط سے آشنا ہوا اور نیک و بد، اَمر و نہی کے متعلق اُسے آگاہی ہونے لگی۔ فرائیڈ نے اپنی کتاب ٹوٹم اینڈ ٹیبو (Totem & Taboo) میں اُن بعض نیم وحشی قبیلوں کا ذکر کیا ہے جو آج بھی اِنسانی تاریخ کے اُسی دَور سے گزر رہے ہیں اور جو عجیب و غریب قواعد کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ اِنسانی تاریخ کے اگلے دَور کا آغاز اُس وقت ہوا جب اِنسانی تخیّل نے پَر تولنا شروع کیے اور افسانوں اور کہانیوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جسے آج ہم دیومالا کے نام سے جانتے ہیں۔ دیکھا جائے تو بچے کی زندگی کا یہ وہی دَور ہے جب وہ رات کے وقت اپنی امّی یا ابّا کے پہلو میں لیٹ کر آج بھی جنوں، پریوں اور شہزادوں کی ننھی منّی کہانیاں سنتا ہے اور بعد اَزاں دُوسروں کو سنانے کی کوشش کرتا ہے...... یہ کہانیاں اُس کے تخیّل کی آزادہ روی کی تسکین کر کے اُسے بے اندازہ مسرّت مہیا کرتی ہیں۔

تاریخِ انسانی کا اگلا دور فرد کے لڑکپن سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔ اب دیومالا کی پُراسرار اور اُلجھی ہوئی کہانیوں کی جگہ مذہب کے ٹھوس نظریات اور زندگی کے اُصول وضوابط لے لیتے ہیں اور بچے کے مذہبی میلانات کی نمایاں طور سے تشکیل ہونے لگتی ہے۔ یہی وہ دور ہے جب انسانی تاریخ میں ہمیں جنگ وجدال کا لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے...... جنگیں جو مذہب، عورت، زمین اور ملک گیری کے لیے لڑی گئیں اور جنھوں نے تاریخِ انسانی کو خون کے اَن گنت دھبوں سے داغ دار کر دیا۔ بچے کی زندگی کا یہی دور لڑنے جھگڑنے، مقابلے اور کھیل کود کی دُنیا میں گزرتا ہے۔ کھیل ایک طرح سے فرد کے جنگجویانہ جذبات کو مائل بہ سکون کرتا ہے اور اُسے تہذیب وتمدن کی شاہراہ پر گام زن ہونے کی تحریک دیتا ہے۔

اس سے اگلا دور (یعنی موجودہ زمانہ) رُومانی دور ہے جو فرد کی اُٹھتی جوانی سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔ اس دور میں جہاں آرٹ، لٹریچر، سائنس اور فلسفے کو بے مثال کامیابی حاصل ہوئی اور سوسائٹی مضبوط بنیادوں پر اُستوار ہوئی نیز جمہوریت، سوشلزم اور کمیونزم کو فروغ حاصل ہوا، وہاں چند ایسی باتوں کو بھی تحریک ملی جن کی وجہ سے آج سوسائٹی کی بنیادوں کے متزلزل ہو جانے کا خطرہ ہے۔ دیکھا جائے تو فرد کی زندگی کا رُومانی دور متضاد رُجحانات کی آماج گاہ ہوتا ہے...... جہاں ایک طرف اُس کی ذہانت نت نئے ساحلوں سے ٹکرانے لگتی ہے، وہاں دُوسری طرف وہ خودکشی، تخریب پسندی اور خود اذیتی کی طرف بھی مائل ہو جاتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو آج انسانی تاریخ ایک ایسے دوراہے پر پہنچ چکی ہے جہاں ایک طرف اُس کی حاصل شدہ تہذیب، سائنس اور علم کی شاہراہ ہے تو دُوسری طرف ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور اسی قبیل کے دُوسرے خطرناک ہتھیاروں سے بنا ہوا راستہ! اب اگر انسان خودکشی کی طرف مائل ہو گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس دُنیا کا شیرازہ بکھر جائے گا؛ اور اگر اُس نے دُوسری شاہراہ اختیار کر لی اور خودکشی کے راستے پر گام زن نہ ہوا تو فرد کی زندگی میں بہت جلد ایسا دور آئے گا جو بھرپور جوانی سے مماثلت رکھتا ہے...... یہ دور تحصیلِ علم، سائنس اور بے پناہ انسانی قوتوں کا دور ہو گا: اس میں انسان بیماری، آبادی اور خوراک پر پُوری طرح قابو پا جائے۔ پھر یہاں سے انسان آہستہ آہستہ فرد کے اس اگلے دور کی طرف گام زن ہو گا جو بالآخر انسانی تاریخ سنہری دور کہلائے گا۔ یہ دور فرد کے "گرہست آشرم" سے مماثلت رکھے گا اور اُس کی بالغ نظری، وسیع المشربی اور اُس کی زندگی کے مسائل پر مضبوط گرفت کا غماز وترجمان ہو گا۔ اس دور کی امتیازی

خصوصیت ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل ہوگی جو افلاطون اور فرانسس بیکن کے مفروضے (Utopia) سے بھی کہیں زیادہ بہتر ہوگی اور جس میں امن، مساوات، انسانی محبت، اخلاقی بلندی اور خیال و اظہار کی آزادی کے طفیل مسرت کو ایک پائیدار بنیاد نصیب ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسا سماج ہوگا جو معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے غیر منقسم اور غیر طبقاتی (Indivisible & Classless) اور اقتصادی و مذہبی لحاظ سے ہر قسم کے نشیب و فراز اور تعصب و عناد سے پاک اور محفوظ ہوگا۔ ہندو علم الاصنام کے مطابق پہلے بھی ایک ایسا دور گزر چکا ہے اور دوبارہ ایک ایسا دور آئے گا جسے ست جگ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں، آیا ایسا کوئی دور واقعی پہلے بھی گزر چکا ہے یا نہیں؛ لیکن اتنا ظاہر ہے کہ ایسا دور آئے گا ضرور، اور سچ پوچھیے تو یہی دور رہنے کے قابل ہوگا۔

فرد کی زندگی کے ادوار کے ساتھ تاریخی ادوار کی مماثلت کرتے چلے جائیں تو لامحالہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ سنہری دور کافی طویل ہوگا لیکن اتنا طویل بھی نہیں کہ اسے انجام ہی نصیب نہ ہو۔ چراغ تمام رات جلتا ہے لیکن صبح ہوتے ہی ٹمٹمانے لگتا ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہے، ہر قدم کی ایک منزل ہے۔ بقولِ عمر خیام، ہر چیز پرانی اور بوسیدہ ہو کر ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک روز یہ سنہری دور بھی ختم ہو جائے گا؛ لیکن آج ہی یہ تشویش کیوں...... ابھی بہت وقت پڑا ہے!

* * *

maablib.org

maablib.org

مسرت اور فلسفہ ۲

اگر آپ غور کریں تو فلسفے کے تین پہلو آپ کو نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔

ایک وُہ کہ جہاں امر و نہی اور عمل و اخلاق کا تسلط ہے۔ اس کے مبلغ وُہ عظیم المرتبت لوگ ہیں جو جسمانی اور ذہنی پاکیزگی کو رُوحانی تربیت کا پہلا اور سب سے اہم سبق قرار دیتے ہیں۔ دُوسرا پہلو وُہ ہے جہاں صرف فہم و خرد کی روشنی میں زندگی اور کائنات کا اِدراک ہوتا ہے۔ یہ پہلو پیدائشی فلاسفہ کا حصّہ ہے اور مغرب کے بیشتر فلسفی اسی زمرے میں شامل ہیں۔ تیسرا پہلو وُہ درمیانی دروازہ ہے جو رُوح اور مادّے اور عمل و تخیل کے سنگم پر واقع ہے اور جس سے گزر کر احساسی اور ذہنی سطح پر کائنات کی لامحدود وسعت کا اِدراک ممکن ہے۔ یہ پہلو مشرق کے عارفوں اور ویدانتیوں کی گزرگاہ ہے۔

فلسفے کا اوّلیں پہلو، جس کا اُوپر ذکر ہُوا اور جو بلند اخلاق اور اعلیٰ اعمال کے زینے پر قدم رکھتے ہوئے آسمانی رفعتوں کی طرف پرواز کناں ہے، دراصل مشرق اور مغرب کے فلسفیانہ نظریات میں ایک "قدرِ مشترک" کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مشرق و مغرب کے قریب قریب ہر مذہب کے پیغمبر نے نفس کشی اور اخلاقی بلندی پر زور دیا اور ذہنی اور جسمانی عشرتوں کو پروردگارِ عالم تک رسائی حاصل کرنے کے راستے میں سنگلاخ چٹانوں کا مترادف جانا۔ غائر نظر سے دیکھیں تو فلسفے کے اس پہلو پر تقدیر پرست تصورات کا تسلط نمایاں نظر آئے گا، یعنی یہ خیال زیادہ اہم ہوگا کہ یہ دُنیا فانی ہے لہٰذا اس کی تمام تر مسرتوں اور عشرتوں پر بھی فنا کے دھندلکے چھائے ہوئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مذاہب میں جنت یعنی اَبدی مسرت کا تصور بڑا واضح ہے۔ مگر اَبدی مسرت کے لیے اس "کارزار" سے بخیر و خوبی نکل آنا بھی ضروری ہے جو زندگی کا جامہ اوڑھے اور ہزاروں حسین و لطیف

اشیا کی صورت میں اِنسان کے دامنِ دِل کو قدم قدم پر اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں فلسفے کا یہ پہلو موجودہ مسرّت پر آئندہ مسرّت کو ترجیح دیتا ہے اور زندگی کی عشرتوں سے مُنہ موڑنے اور خود کو آرزوؤں اور اُمنگوں سے چھٹکارا دِلانے ہی کو رُوحانی سُرور اور اَبدی مسرّت کی سب سے اہم شرط قرار دیتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِنسانی خواہش کے تُند بہاؤ کے راستے میں (جسے شوپن ہار نے بھوکی خواہش کا نام دیا تھا) اِس فلسفۂ حیات نے بند باندھ کر ایک طرح سے سوسائٹی کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اخلاقی و سماجی اَقدار کو معرضِ وُجود میں لا کر اِنسان کو ایسا مضبوط ضابطۂ حیات مرحمت فرمایا جس کے بغیر شاید ہماری تہذیب کا اِرتقا آج سے کہیں پہلے رُک چکا ہوتا۔ لیکن اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فلسفے کے اِس پہلو نے جب رُوزمرہ زندگی کے حلقے سے نکل کر رُوحانی بلندی کو اَپنی منزل کا ستارہ بنایا اور اِس منزل تک پہنچنے کے لیے ایک طویل نفس کُشی تجویز کی تو اِنسانی مسرّت کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا اور زندگی سمٹ کر ایک تاریک سے خول میں مقید ہونے لگی۔ چنانچہ عجم میں صُوفی اِزم کے اِرتقا اور ہندوستان میں یوگ اور بھگتی کی تحریک اور مہاتما بُدھ کے فلسفۂ حیات نے رُوزمرہ زندگی سے اِنسان کو منحرف ہونے اور زندگی کی ایک ایسی طویل شاہراہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دی کہ جس کے خاتمے پر تو نروان کا چراغ روشن تھا لیکن جس پر سفر کے دوران میں اُداسی اور بے بسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ البتہ نِروان سے مراد خواہش کا خاتمہ تھا اور خواہش چونکہ آلام و مصائب کا منبع تھی لہٰذا خواہش کے خاتمے پر ہی سکونِ قلب اور اَبدی مسرّت کا حصول ممکن تھا۔ درحقیقت یہ طریق منفی مسرّت کا علم بردار تھا اور اِس پر عمل پیرا ہونے کے لیے طویل نفس کُشی اور غیر فطری زندگی کی ضرورت تھی۔

فلسفے کے اِس پہلو کا ایک رنگ یہ بھی تھا کہ اِس نے طالب یعنی اِنسان کو حقیر و ذلیل قرار دیا اور صرف مطلوب یعنی خالق کو اُن اَرفع خصوصیات کا مظہر جانا جنھیں پانے کے لیے طالب کے لیے اَز بس ضروری تھا کہ وُہ اپنی اِنفرادیت کو یکسر تج دے اَور صرف مطلوب کی خوشنودی کو اَپنے پیشِ نظر رکھے۔ چنانچہ بیشتر اَوقات اِس فلسفۂ حیات کی بدولت خُدا کو کائنات میں وُہی مقام حاصل ہو گیا جو اُس زمانے میں کسی ملک کے بادشاہ کو حاصل تھا' اور اِنسان کا فرض یہ قرار پایا کہ وُہ زندگی کی رعنائیوں سے مُنہ موڑ کر خُدا کے آستانے تک پہنچنے کی سعی کرے۔ اِس سلسلے میں اسد المحاسبی کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

خُدا نے اپنے جویا کے لیے خود اَذیتی تجویز کی ہے تاکہ اُس کی رُوح تربیت پا سکے۔ لوگ اُس اِنسان کی عظمت کا اَندازہ نہیں کر سکتے جس کے ذہن میں سوائے پروردگارِ عالم کے دُوسرا کوئی خیال نہ ہو، جو ہر لحظہ آسمانی خوف کے تحت آنکھوں میں آنسو بھرے، انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ بسر اَوقات کر رہا ہو...... جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں، سَر میں خاک ہو، گریباں چاک ہو اَور جسے اِس بات کا خیال بھی نہ آئے کہ اُس کا لباس تار تار ہے، جو اکیلا، اجنبی اَور تنہا ہو......

اِسی طرح جلال الدین رومیؒ، ایک جگہ رقم طراز ہیں:

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ابراہیم نے کہ تخت پر جلوہ افروز تھا، محل کی چھت پر بھاری قدموں کے چلنے کی آواز سُنی۔

اُس نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے پکارا...... کون ہے، کون ہے؟

سپاہیوں نے اپنی گردنیں خم کر دیں اَور کہا...... حضور، ہم ہیں اَور تلاش کر رہے ہیں۔

کیا تلاش کر رہے ہو؟...... ابراہیم نے پوچھا۔

حضور، اُونٹ تلاش کر رہے ہیں...... اُنھوں نے جواب دیا۔

ابراہیم نے حیرت سے کہا...... بیوقوفو! کیا کبھی کسی نے چھت پر اُونٹ کی تلاش کی؟

حضور!...... اُنھوں نے اطمینان سے جواب دیا...... ہم تو آپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں: آپ بھی تو تخت پر بیٹھے خُدا کی تلاش کر رہے ہیں......

ظاہر ہے کہ خُدا کے حضور پہنچنے کا یہ طریق خود اَذیتی کے خارزار سے ہو کر گزرتا ہے اَور فلسفے کے اِس پہلو کے گہرے رنگ کا غمّاز ہے۔ بُدھ اِزم اَور بھگتی کی تحریکوں میں بھی خود اَذیتی کا یہ رنگ نمایاں ہے اَور یوگ کی ورزشیں بھی بڑی حد تک اِسی طرزِ عمل کا اِظہار ہیں۔

فلسفے کا یہ پہلو جو عام زندگی میں تو اَمر و نہی اَور حُسنِ اخلاق کے تابع ہے، جب رُوحانی فتوحات کی مہم پر نکلتا ہے تو اِنسان کے پاؤں میں قواعد و اخلاق کی بھاری سلاسل ڈال دیتا ہے، اَور اِنسان سے رُوحانی عظمت کے حصول کے لیے ذہنی اَور جسمانی، ہر طرح کی قربانی طلب کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِنسان اکثر و بیشتر راہ و رسمِ منزل ہا کو "منزل" کا مترادف سمجھ بیٹھتا ہے اَور محض زُہد و اِتقا کو زندگی کا آخری مرکز اَور خُدا تک رسائی کا واحد ذریعہ قرار دے دیتا ہے۔ چنانچہ اصل منزل تو گم ہو جاتی ہے اَور زُہد و پارسائی کے طفیل ایک نچلے درجے کی تمکنت اَور رُعونت جنم لے لیتی ہے۔ رُوحانی مسرّت کے راستے میں یہ بہت بڑی رُکاوٹ ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ خُدا تک رسائی کے لیے خود اَذیتی اَور نفس کُشی کا راستہ کافی طویل ہے اَور بہت کم

لوگ اِس "صراطِ مستقیم" پر سے صحیح و سالم گزر سکتے ہیں۔ صوفیا کرام میں رابعہ بصریؒ ایسی برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے جادۂ منزل کو تو کم اہمیت دی لیکن منزل پر اپنی نگاہیں برابر مرکوز رکھیں:

> خدا! اگر میں تیری عبادت اس لیے کروں کہ مجھے جہنم کا خوف ہو تو مجھے جہنم میں ڈال دے؛ اور اگر میں تیری عبادت اِس لیے کروں کہ مجھے جنت کی آرزو ہو تو مجھے جنت میں داخل نہ ہونے دے؛ لیکن میں تجھے صرف تیرے لیے چاہوں تو اے خدا' اپنے حسنِ لازوال سے مجھے ہرگز محروم نہ رکھنا!

پھر بھی خدا تک پہنچنے اور روحانی ملاپ حاصل کرنے کا یہ راستہ' ایک منفی راستہ ہے اور یہ کرم یوگ اور بھگتی کے مشکل مقامات سے گزر کر گیان تک پہنچتا ہے؛ نتیجۃً ایک طویل نفس کُشی روحانی سُرور کے امکانات کو رُو بہ زوال کر دیتی ہے۔

فلسفے کا دوسرا پہلو جس کے ترجمان مغرب کے بیشتر فلاسفہ ہیں اور جس کے طفیل صرف فہم و خرد کی روشنی میں کائنات کا ادراک ہوتا ہے' ایک علیحدہ بحث کا طالب ہے؛ اسی لیے ہم ایک علیحدہ باب میں اس پر گہری نگاہ ڈال چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس بات کا اعادہ کرنے پر اکتفا کریں گے کہ اس پہلو نے الفاظ کے "اندر جال" اور "دلیل در ماورائے دلیل" کے چونے گارے سے جو رنگ محل تعمیر کیا ہے وہ ہمارے ذہنی تناؤ (Mental Tension) کو آسودہ کر کے ہمیں مسرت ضرور بہم پہنچاتا رہا ہے...... یہ مسرت اس مسرت سے شدید مماثلت رکھتی ہے جو کسی ریاضی داں کو اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ریاضی کے کسی مشکل سوال کو کافی تگ و دو کے بعد حل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ مسرت شاید اُس روحانی مسرت کی رفعت کو نہیں پہنچتی جو فلسفے کے تیسرے پہلو یعنی دل و دماغ کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے اور جو انسان کو خیالات و احساسات کی ایک سطح سے یک لخت' لاشعوری طریق سے خیالات و احساسات کی ایک بلند تر سطح پر لے جا کر احساسِ بحر آسا (Oceanic Feelings) سے ہم کنار کر دیتی ہے۔

آئیے اب فلسفے کے اسی تیسرے پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں!

ایک طرح سے دیکھا جائے تو فلسفے کا یہ پہلو جو ویدانت اور عرفان کے ارفع تصورات کی اساس پر استوار ہے' بعض حلقوں میں خاصا بدنام ہو چکا ہے۔ اِن حلقوں نے اِس اندازِ نظر کو فرار کا راستہ قرار دیا ہے اور اس حسین تجربے سے یکسر انکار کر دیا ہے جو عارف یا ویدانتی کی روحانی عظمت کا تنہا تماشائی ہے لیکن جسے وہ بدقسمتی سے ٹھوس حقائق کی طرح دکھانے سے قاصر ہے۔ موجودہ زمانے میں کسی شے کا وجود اُس وقت تک مانا نہیں جاتا جب تک کہ اُسے حسیات یا سائنسی آلات سے ثابت

نہیں کیا جاتا...... اِسی لیے یہ لوگ عارف یا ویدانتی کے رُوحانی تجربے کو ایک افیونی کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اِس سے حاصل شدہ گہری مسرت کو انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے بیکار بلکہ مُضر قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ شاید اِس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ہماری حسیات نہ صرف کمزور ہیں بلکہ اِن کی تعداد بھی بہت محدود ہے اور جہاں تک سائنسی آلات کا تعلق ہے، ہم ابھی تک ایک بحرِ ذخار کے کنارے پر کھڑے، کھلونوں سے کھیل رہے ہیں۔ اگر ہمیں کسی طرح ایک مزید حس عنایت ہو جائے تو شاید ہمیں یہ کائنات ایک نئے رُوپ میں نظر آئے۔ اِسی طرح، ہو سکتا ہے کہ کل کو ایک ایسا سائنسی آلہ ایجاد ہو جائے جو زندگی کے متعلق ہمیں نئے نئے اِنکشافات بہم پہنچائے اور ہم کائنات کی لا محدودیت کا نئے طریق سے اِدراک کرنے میں کامیاب ہو جائیں ...... کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابھی بہت سی ایسی چیزیں (Phenomenae) بھی ہیں جنھیں ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں اور ہمارے کان سُن نہیں سکتے لیکن ہمارے دل و دماغ کی عظیم قوتوں کو جن کے وُجود کا احساس ہے...... عارف یا ویدانتی کا رُوحانی تجربہ بھی ہمارے دل و دماغ کی اِنھیں قوتوں کا ایک کرشمہ ہے اور اِس کا مزہ وہی شخص چکھ سکتا ہے جس نے خود اِن منازل تک رسائی حاصل کی ہو۔

اِس رُوحانی تجربے کی گہرائیوں تک اُترنے اور اِس سے بے اندازہ مسرت حاصل کرنے کے لیے ویدانت کے فلسفے کی روشنی میں، کائنات کی لامحدودیت کا علم حاصل کرنے اور اِس لامحدودیت کو محسوس کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اُپنشد میں ویدانت کے نظریے کو ایک کہانی کے رُوپ میں اِس طرح پیش کیا گیا ہے:

جب سویتکا بارہ ۱۲ برس کا ہوا تو اُسے ایک عالم کے پاس بھیج دیا گیا جہاں وہ چوبیس ۲۴ برس کی عمر تک ٹھہرا۔ تمام وید و دُنیا کے تمام علوم اُس نے وہیں حاصل کیے۔ جب وہ واپس لوٹا تو باپ نے پوچھا:

سویتکا...... میرے بچے! تو نے اِتنے علوم حاصل کیے، کیا تو نے وہ علم بھی پڑھا جس کے طفیل ہم وہ سُن سکیں جو سُنا نہیں جا سکتا، وہ دیکھ سکیں جو دیکھا نہیں جا سکتا اور وہ جان سکیں جو جانا نہیں جا سکتا؟

وہ علم کیا ہے پتا جی!...... سویتکا نے حیرت سے پوچھا۔

باپ بولا...... اُس سامنے والے درخت کا ایک پکا ہُوا پھل لے آ!

لیجیے!

اِسے کاٹ دے!

کاٹ لیا۔

تجھے کیا نظر آیا؟

کچھ بیج۔

اِن میں سے ایک بیج کو کاٹ دے!

کاٹ لیا۔

اِس میں کیا نظر آیا؟

کچھ بھی نہیں۔

باپ نے کہا...... بیٹا یہی تو تیری غلطی ہے! تجھے وہ گُودا کیوں نظر نہیں آیا جس میں درخت کا سارا وُجود سمایا ہُوا ہے؛ وہ جو ساری حقیقت کا عطر ہے...... وُہی تو سچائی ہے، وُہی تو حقیقت ہے! اور سویتکا، میرے بچے، وہ تُو ہے...... تت توام آسی!

وہ تُو ہے (That Thou Art)، ویدانت اور عارفانہ تصوّرات کا پہلا سبق ہے۔ اِس سے مُراد یہ ہے کہ وسیع و بے کنار، لامحدُود و لازوال کائنات، جو آغاز و انجام سے بے نیاز اور زماں و مکاں سے ماوراء ہے...... فقط تُو ہے لیکن "تُو" سے مُراد ایک فرد کا محدُود جسم نہیں...... "تُو" وہ زبان ہے جس سے کائنات کی لامحدُود وسعت اپنا اِظہار کرتی ہے۔

مگر "وہ تُو ہے" صرف خطابت کے لیے ویدانت میں مستعمل ہے، ورنہ ایک ہی قدم اُٹھانے پر یہ فقرہ حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ "وہ میں ہوں" (آہم برہم) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کائنات کی زبان سے نکلی ہُوئی آواز بن جاتا ہے...... یہی عارفانہ تصوّرات اور ویدانتی اَفکار کا عطر ہے:

ہرگز مجھے نظر نہیں آتا وُجُودِ غیر
عالم تمام ایک بدن ہے میں دیدہ ہُوں

اِس سلسلے میں ویدانت نے اَشیا کو اِرتقا کے تین مدارج یعنی تموگن، رجوگن اور ستوگن میں پیش کیا ہے۔ تموگن سے مُراد وہ اَشیا ہیں جو حرکت نہیں کر سکتیں، لیکن محسُوس کر سکتی ہیں: مثلاً نباتات۔ رجوگن سے مُراد وہ اَشیا ہیں جو حرکت بھی کر سکتی ہیں اور محسُوس بھی کر سکتی ہیں: مثلاً چرند پرند۔ ستوگن آخری منزل ہے؛ اِس سے مُراد وہ اَشیا ہیں جو حرکت بھی کرتی ہیں، محسُوس بھی کرتی ہیں اور سوچ بچار بھی کر سکتی ہیں: مثلاً اِنسان۔ گویا سوچ بچار کی صلاحیت ہی ایسی چیز ہے جو اِنسان کو نباتات اور حیوانات سے ممیّز کرتی ہے...... دیکھا جائے تو یہی زندگی کا اِرتقا اور حیات کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ لیکن

سوچنے کی صلاحیت جب قوتِ احساس اور تحرک سے لیس ہو کر نکلتی ہے تو کائنات کی اُس عظیم قوت کا رُوپ دھار لیتی ہے جس کے سہارے کُل کا احساس و ادراک ممکن ہے۔ زندگی ارتقا کے مندرجہ بالا تینوں مدارج پر تو مشتمل ہے لیکن اپنا بہترین اظہار صرف انسان کے ذریعے کر سکتی ہے' اس لیے جب انسان رُوحانی اور احساسی ترقی کی آخری چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو لامحالہ اُن اجزا کی بھی آواز بن جاتا ہے جو ابھی تموگن اور رجوگن کے ادوار سے گزر رہے ہیں۔

اور جب اس آواز میں خود آگہی پیدا ہوتی ہے اور انسان اپنی خودی کو پہچانتا ہے تو معاً اُس کا احساس ایک محدود جسم سے پھیل کر اُس وسیع و لامحدود کائنات کا بھی احاطہ کر لیتا ہے جس کا وہ نمایاں اظہار ہے...... ایسا کرنے سے وہ احساس بحر آسا معرضِ وجود میں آتا ہے جو بیشتر جسمانی و ذہنی مسرتوں سے ارفع اور لطیف ہے اور جسے ویدانتی ایک حسین تجربے یعنی خدا کے ساتھ وصال کے مسرت آفریں لمحے سے یاد کرتے ہیں اور جو اُن کے بقول انسانی زندگی کی سب سے بڑی جیت ہے۔

یہ خود آگہی ایک طویل ذہنی اور رُوحانی تربیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ عشقِ حقیقی کے مذہبی ارتقا کو جہاں خالص علمی نقطۂ نظر سے شرون (علم الیقین)' منن (عین الیقین) اور ندھیاسن (حق الیقین) کے مختلف مدارج سے ظاہر کیا گیا ہے' وہاں اس کے جذباتی مدوجزر کو بھی تین مختلف منازل یعنی وویک' ویراگ اور موکشا تفویض کی گئی ہیں۔ وویک سے مراد ست کو اَست سے' فانی کو غیر فانی سے اور سچ کو جھوٹ سے ممیز کرنا ہے۔ دوسری منزل وہ ہے جب انسان پر کسی ناگہانی حادثے یا عزیز ترین شخص کی اچانک موت کی وجہ سے دفعۃً دنیا کی بے ثباتی کا راز فاش ہوتا ہے تو اس کے دل میں اس دنیا کے لوازم کے خلاف زبردست نفرت کا جذبہ کروٹیں لینے لگتا ہے اور اُسے دنیا جہان کی ہر شے رنگینیوں اور لطافتوں سے محروم نظر آنے لگتی ہے۔ یہ جذبہ اس بیزاری' بدمزگی یا ویراگ کی حالت کو ظاہر کرتا ہے جو عشقِ حقیقی کی طرف ایک اہم اقدام ہے اور جس کا اشارہ پاتے ہی انسانی جذبات سنیاس کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ عشقِ حقیقی کی تیسری حالت موکشا کا مطلب خواہشِ نجات ہے۔ زیست کے آلام و افکار سے نجات حاصل کرنے کی یہ خواہش ایک ایسی محیط و بسیط ہستی کو اپنی منزل کا ستارہ بنا لیتی ہے جو اُسے دنیاوی خلش اور بے رنگ و بُو زندگی کے بجائے لاانتہا مسرت اور ناقابلِ بیان لذت سے ہم کنار کر سکے (لذت اور صوفیانہ تصورات از مصنف مشمولہ ادبی دنیا' جولائی ۱۹۴۷ء)۔ لیکن فلسفے کے دیگر نظریوں کے برعکس ویدانت کے مطابق یہ لامحدود ہستی' جس کے ساتھ

وصال بے اندازہ رُوحانی مسرت کا ضامن ہے کوئی علیحدہ مستقل ہستی نہیں، یہ فرد کی شانِ کُلّی کی ایک صورت ہے۔ چنانچہ ویدانت کا سارا نظریہ ایک ہی نقطے پر رقصاں ہے: یعنی شانِ جزوی سے شانِ کُلّی کی طرف برق رفتار پیش قدمی...... تمام صاحبِ کمال عارفوں اور ویدانتیوں نے اپنے اپنے رنگ میں اِس پیش قدمی کو وہ روشنی قرار دیا ہے جس نے اُنھیں ایک احساسِ بحرآسا سے ہم کنار کر کے اُن کی غم واندوہ سے بھرپور جزوی زندگی کو ختم کر دیا اور اُنھیں سکون و مسرت کی کُلّی زندگی عطا کر دی۔

عارف یا ویدانتی کے مطابق ہمارے مسلسل کرب و اَلم کا باعث وہ غلط زاویہ ہے جس سے ہم زندگی اور کائنات کو دیکھتے ہیں اور جس کی وجہ سے عظیم و لامحدود کائنات اور اس کی بے پناہ قوتوں کے مقابلے میں ہمیں اپنی محدودیت، فنا اور تہی دستی کا بُری طرح احساس ہوتا ہے۔ بس غور سے دیکھا جائے تو ہماری بیشتر ذہنی و جسمانی صعوبتوں کا باعث وہ احساسِ کمتری و کم مائیگی ہے جو قدم قدم پر ہماری راہ میں حائل ہے اور جو ہمیں مستقل طور پر اِس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ہم فطرت کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلیاں ہیں جو انہونی خواہشات اور ان دیکھے طبعی رجحانات کے اشاروں پر ناچتے ناچتے تاریکی سے برآمد ہوتی ہیں: تھوڑی دیر روشنی میں ناچ دکھاتی ہیں اور پھر ناچتے ناچتے تاریکی میں گم ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔ فنا ہو جانے کا یہ خوف، تہی دستی کا یہ احساس اور کمتری و کمزوری کا یہ پہلو دراصل ہماری مسرت کا سب سے بڑا حریف ہے اور ویدانت کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیں ایک ہی جست میں اِس تاریک خول سے اوپر اٹھا کر ایک ایسے سنگھاسن پر بٹھا دیتا ہے جہاں کائنات کی اندھی قوتیں ہمیں اپنی گرفت میں محسوس ہوتی ہیں اور ہم فنا اور کمتری سے بلند ہو کر ایک عظیم و لامحدود قوت میں نہ صرف تحلیل ہو جاتے ہیں بلکہ اُس کے ترجمان بھی بن جاتے ہیں۔

لامحدودیت کا یہ علمِ ویدانت کا نہایت نمایاں پہلو ہے...... وہ پہلو جو ہمیں رُوحانی تجربے کی مسرتوں کی طرف گام زن کر سکتا ہے۔

لیکن کیسے؟

وہ اِس طرح کہ (ویدانت کے مطابق) یہ ساری کائنات جس کا اِدراک ہم اپنے حواسِ خمسہ کرتے ہیں، محض مایا (سراب) ہے لیکن ہم اس کی غیر مستقل کیفیات و مظاہر میں اِس درجہ محو ہو چکے ہیں کہ ہمیں وہ حقیقت نظر نہیں آتی جو اِن سب کے پس پشت زندہ و قائم ہے: بعینہٖ جس طرح سمندر کو دیکھتے ہوئے ہمیں صرف اُن موجوں کا احساس ہوتا ہے جن کی اپنی کوئی حقیقت نہیں اور اس سمندر کو ہم

بھول جاتے ہیں جو حقیقت ہے اور جس سے موجیں جنم لیتی ہیں اور جس میں آخرش تحلیل ہو جاتی ہیں۔

اس مسئلے پر ویدانت نے ایک اور طرح سے بھی روشنی ڈالی ہے: وہ اس طرح کہ انسان ہر رات خواب کے رنگ محل بناتا ہے اور ایک فرد کے لباس میں اس کی مختلف منازل سے گزرتے ہوئے، خوشی اور غم سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ چونکہ خواب کے دوران میں اُسے اپنی خواب بیں حیثیت کا علم نہیں رہتا، لہٰذا وہ انتہائی سنجیدگی سے ہر چیز کو ٹھوس حقیقت سمجھتا ہے اور اُسے ایک لمحے کے لیے بھی شُبہ نہیں ہوتا کہ یہ سب خواب ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو خواب کے دو پہلو ہوتے ہیں...... ناظر (Subject) اور منظور (Object)۔ ناظر سے مُراد وُہ ہستی ہے جو خواب بیں کے ہمزاد کا رُوپ دھار کر، خواب کی فضا میں متحرک رہتی ہے اور خوشی و غم سے نبرد آزما ہوتی ہے، اور منظور سے مُراد خواب کے وُہ تمام دُوسرے عناصر و مظاہر ہیں جن کا خواب کے ناظر کو سامنا ہوتا ہے۔

ویدانت کے مطابق یہ کہنا غلط ہے کہ خواب کا ناظر ہی خواب کا خالق ہے۔ دراصل خواب کے ناظر اور منظور دونوں غیر حقیقی ہیں اور دونوں کا وُجود محض خواب بیں کی روشنی طبع کا رہینِ منت ہے۔ خواب بیں کے غم و اندوہ کا باعث صرف یہ چیز ہوتی ہے کہ وُہ وقتی طور پر اپنی ہستی کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور خود کو خواب کے ناظر سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ مگر جس لمحے اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وُہ خواب دیکھ رہا ہے، اُسی لمحے خواب کا سارا گھروندا (جو ناظر و منظور پر مشتمل ہے) نیچے آ گرتا ہے۔

اِسی طرح جاگتے کی دُنیا بھی ناظر و منظور پر مشتمل ہے: لیکن عام طور پر فلاسفہ سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ اُنھوں نے اِس دُنیا کے ناظر و منظور کو بھی حقیقی تصور کر لیا ہے اور اِس بات کو فراموش کر دیا ہے کہ خواب کے ناظر و منظور کی طرح، بیداری کے ناظر و منظور بھی غیر حقیقی ہیں، اور دونوں کا وُجود اُس خواب بیں، اُس سچے آتما کا مرہُون ہے جو اگرچہ ساری کائنات کے پس پشت واحد زندہ حقیقت ہے لیکن جو بظاہر ناظر و منظور میں بٹ کر محدود ہو گیا ہے۔

ویدانت کے مطابق فرد کے آلام و مصائب تب تک ختم نہیں ہوں گے جب تک کہ وُہ ناظر و منظور دونوں سے بلند ہو کر کائنات کا جائزہ نہیں لے گا: اور جب ایسا ہُوا تو اُسے صاف محسوس ہوگا کہ کائنات کی تمام اَشیا، تمام کیفیات اور تمام کردار (حتیٰ کہ اس کا جسم بھی)، اُس کی ہستی کے لامحدود پھیلاؤ میں سمٹے ہوئے ہیں اور وہ خود ہی کائنات کی ہر شے میں جلوہ گر ہے۔ یہاں میں اپنے ایک

بزرگ کی بیاض سے چند جملے رقم کرتا ہُوں:

ناظر و منظور میرے ہی خیال کی دو شاخیں ہیں۔
اپنے ہی خیال سے میں ایک طرف ناظر ہو کر بھاستا ہُوں۔
اپنے ہی خیال سے میں دُوسری طرف منظور ہو کر نمودار ہو رہا ہُوں۔
خیال بھی فرضی 'من گھڑت' ...... دونوں شاخیں بھی من گھڑت 'نیند' کے باعث پُرش اپنے آپ کو ناظر (یعنی کرتا بھوگتا جیو) مان رہا ہے...... کیا معنی کہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ ہستی مان رہا ہے!
نتیجہ...... کثرت انیک ہستیوں کا بھان!
اگر اپنے آپ کو ویاپک لے یعنی سب میں موجود دیکھے تو نتیجہ...... وحدت 'ایکتا' کا بھان!

سوامی رام تیرتھ اِس اہم نکتے کے متعلق رقم طراز ہیں:

جس ایک لمحے اِنسان کو احساس ہُوا کہ وہ کُل ہے تو سمجھیے کہ اُسی لمحے وہ اپنی حقیقت کو پا گیا۔ اَب وہ آزاد ہے...... تمام خطرات سے محفوظ؛ ہر خوف سے بے نیاز؛ ہر رنج' ہر دُکھ سے آزاد!

آہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ہی غیر محدود قوت' تمام اَشکال میں اپنا رُوپ دکھا رہی ہے؛ تمام شخصیتوں' تمام صُورتوں میں جلوہ گر ہے...... میں ہی وہ غیر محدود قوت ہُوں کہ جس کے تخیل نے یہ لیلا رچائی ہے۔ اَشکال اَن گنت ہیں' رُوح ایک ہے اَور وہ رُوح "مَیں" ہُوں۔

انتھونی (Anthony) نے محض جذبات میں' بروٹس (Brutus) نے محض شان و شکوہ میں اَور سیزر (Caesar) نے محض حصولِ مملکت میں مسرت کی تلاش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اول الذکر کو ذلت ملی' دُوسرے کو نفرت اَور آخر الذکر کو ناشکر گزاری؛ اَور ہر ایک بغیر مسرت حاصل کیے فنا ہو گیا......

...... سچ ہے محض انکشافِ ذات (آتم انوبھو) ہی میں مسرت کا سارا خزینہ پوشیدہ ہے۔

اِس بات کا علم حاصل کرو کہ سوائے تمھارے اَور کوئی چیز موجود نہیں اَور کوئی چیز موجود رہ ہی نہیں سکتی کیونکہ تم ہی لامحدودیت کا واحد اِظہار ہو۔ اَب اپنی لامحدودیت کو محسوس کرو!

سوامی رام تیرتھ کا ایک اَور فقرہ ہے:

God is like a circle whose centre is everywhere, but circumference nowhere: realize that and you are free!

لامحدودیت کے علم کے ساتھ ساتھ' لامحدودیت کا یہ احساس ہی وہ پہلو ہے جس نے عارفانہ تصورات کو اِمتیازی صُورت عطا کی ہے اَور یہی وہ مقام ہے جہاں جسم و رُوح اَور فہم و احساس کا حسین اِمتزاج ممکن ہے۔ ویدانت کے مطابق سچائی کی یہ دریافت' سچائی کا یہ احساس ہی ہمارے اُن تمام دُکھوں کا واحد علاج ہے جو ایک جھوٹی نمود کے باعث معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

اب اگر ہم پلٹ کر اپنی تحقیقات پر ایک بھرپور نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ محبت، آرٹ، زندگی اور فلسفے میں مسرت کے بہترین لمحات وہی ہوتے ہیں جب انسان اپنی انفرادی ہستی کو یکسر فراموش کر کے ایک اجتماعی کیفیت میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ نتیجۃً ایسی ایسی حیرت انگیز چیزیں معرضِ وجود میں آتی ہیں جو نہ صرف اپنے خالق کے لیے باعثِ مسرت و راحت ہوتی ہیں بلکہ اپنی شدید اجتماعی کیفیت کے باعث ہزاروں لاکھوں افراد کو بھی مسرت سے ہم کنار کر دیتی ہیں۔ مگر جونہی انسان خود فراموشی کی کیفیات سے محدود خودی کے قفس میں پہنچتا ہے، یہ سارا طلسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ کائنات جو بذاتِ خود ایک حیرت انگیز معجزہ ہے، کسی مقصد (motive) یا مقصدی کاوش کا نتیجہ نہیں، یہ بے پایاں خود فراموشی کی پیداوار ہے...... وہی خود فراموشی کہ جس میں ابدیت کے سارے عناصر موجود ہیں اور جس میں تحلیل ہو کر خود انسان بھی ابدیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ عارفانہ تصورات کا منتہا بھی انسان کو اسی کیفیت کی ابدی رفاقت بہم پہنچاتا ہے جس کی جھلک اسے زندگی کی ارتقائی کیفیات (محبت، آرٹ اور فلسفے) میں وقتاً فوقتاً ملتی تھی اور جس کا وجود اگرچہ لمحاتی ہوتا تھا، لیکن جس کے طفیل انسان کو روحانی سرور کے لازوال لمحات ضرور ارزانی ہو جاتے تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ عارف کا یہ حسین تجربہ، لامحدودیت کے ساتھ ابدی وصال کی یہ کیفیت محض انفرادی مسرت کی علم بردار نہیں، یہ اپنے نتائج کے طفیل عالم گیر انسانی مسرت کی کفیل بھی ہے...... وہ اس طرح کہ جو دل ایک بار روحانیت کے اس جام سے سرشار ہوا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسان سے اس شدید محبت کا علم بردار بن گیا جسے آفاقیت کے ہمہ گیر لفظ کے سوا دوسرے کسی نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا...... ایسے انسان کو رنگ، نسل اور محدود مذہبی اور طبقاتی میلانات کی وہ قیود و حدود بے معنی نظر آتی ہیں جو فرد کو فرد سے نفرت سکھا کر زندگی سے مسرت کی آخری رمق بھی چھین لینے کے درپے ہیں اور جنھوں نے کچھ عرصے سے انسان کی پُرکیف کائنات کو بے برگ و بار کر دیا ہے۔

فرد، سماج اور مسرت

فرد، سماج اور مسرت کا زیرِ نظر باب، میرے مطالعۂ مسرت کا آخری باب ہے۔ میں نے اس کتاب کے آغاز میں عام زندگی میں مسرت کے امکانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، لیکن زیادہ تر میرا مقصد مسرت کی توضیح پیش کرنا تھا۔ بعد ازاں میں نے مسرت کے تدریجی ارتقا کو واضح کرنے کے لیے محبت اور آرٹ اور مشرق و مغرب کے فلسفیانہ نظریات کو زیرِ بحث لا کر مسرت کی ارتقائی کیفیات کا بھی جائزہ لیا۔ از بسکہ مسرت نہ صرف عام انسانی زندگی سے شدید طور پر وابستہ ہے بلکہ اس کی بقا کے لیے خونِ گرم کا درجہ بھی رکھتی ہے، لہٰذا یہ مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا جب تک کہ یہ فرد اور سماج کے مابین اس گہرے سمجھوتے کا جائزہ نہ لے جسے مضبوط تر کرنے کے لیے عام انسانی مسرت کے علاوہ محبت، آرٹ، فلسفے اور روحانی تصورات سے حاصل شدہ مسرت کی ارتقائی کیفیات بھی معرضِ وجود میں آتی ہیں، اور جس کی مضبوطی کے باعث کائنات کا یہ سب سے بڑا معجزہ، جسے ہم انسانی زندگی کے نام سے جانتے ہیں، اپنی تمام تر رعنائیوں اور بوالعجبیوں کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

فرد اور سماج کے ناقابلِ شکست رشتے کی تفہیم کے لیے اس بات کو مدِّنظر رکھنا ضروری ہے (اور میں پہلے بھی اس کا اظہار کر آیا ہوں) کہ انسان، حیوان کے برعکس، اپنے سماجی ماحول سے باہر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کی دو نمایاں وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ جانور کی بہ نسبت انسان جسمانی طور پر کمزور ہے اور اپنے ساتھیوں کے بغیر اور خاندان، قبیلے یا قوم کی سرپرستی کو تج کر اس خطرناک صورتِ حال سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا جس میں جہد للبقا کا اصول سرگرم ہے اور جس میں حیوان نسبتاً زیادہ محفوظ ہے۔ دوسری یہ کہ زندگی کے آغاز میں انسان کی ذہنی ترقی اور جسمانی ترقی کے مابین شدید غیر ہمواری

موجود تھی۔ یعنی اِس دُنیا میں وارد ہونے کے بعد اُس کا جسم ابھی حالات سے موافقت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہُوا تھا کہ اُس کا ذہنی شعور ترقی کر کے اُسے اپنے ماحول کا اِدراک کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ نتیجۃً اُسے محسوس ہونے لگا کہ وُہ اپنے کمزور اعضا کے ساتھ حادثات کا مقابلہ کرنے کے لیے اِس خطرناک دُنیا میں یکہ و تنہا رہ گیا ہے۔ چنانچہ ایک احساسِ کم مائیگی نے جنم لیا جو بتدریج اُس کے احساسِ تنہائی کا محرک بنتا گیا، حتیٰ کہ انسان کو اَیسے حربوں کی ضرورت پیش آئی جن کے طفیل وُہ اپنی کمزور صورتِ حال میں بھی حادثات کا مقابلہ دلیری سے کر سکتا۔ اِن حربوں میں گفتار، جنسی محبت اَور آرٹ کے حربے زیادہ نمایاں تھے کہ اِن کی بدولت اُسے آگے چل کر اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ذہنی اَور جسمانی مفاہمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملے اَور یُوں اُس سماج کی بنیادیں مضبوط تر ہونے لگیں جو اُس کے خطرناک ماحول کا واحد علاج تھا اَور جس کا ایک جُزو بن کر وُہ جہد للبقا میں حیوان پر نمایاں برتری حاصل کر سکتا تھا۔

پس فرد کا تحفظ ہمیشہ سے اُس کے سماج کا رہینِ منت رہا ہے...... یہاں تک کہ جسمانی یا ذہنی طور پر کسی فرد کو اُس کے سماجی ماحول سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیں تو اُس کی زندگی مسرت سے تہی رہ جائے گی۔

اُوپر میں نے اُن چند حربوں کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعے فرد اپنے سماج کے ساتھ گہرے پائیدار رشتے اُستوار کرتا ہے۔ اُن میں سے گفتار اَور آرٹ کے حربے تو اُسے عام زندگی میں اپنے ساتھیوں سے ہم کلام ہونے اَور اُنھیں سمجھنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں جبکہ جنسی محبت کا حربہ نسلِ انسانی کو جاری رکھنے اَور فرد کے چاروں طرف خاندان اَور قبیلے کی ایک سوشل فضا قائم کرنے میں اُس کا معاون ثابت ہوتا ہے، مگر اِن حربوں پر سماج کی قیود و حدود مسلط ہوتی ہیں۔ فرد کے لیے ضروری قرار پاتا ہے کہ وُہ اپنے اَور سوسائٹی کے تحفظ کے لیے اِن قیود کے تابع رہے۔ ہاں کبھی کبھی اپنے ترقی پذیر ذہن کی بدولت، احساس کی لطافت سے متاثر ہو کر، فرد اپنی سوسائٹی کی قیود و حدود کو ایک قیدی کی طرح دیکھتا ہے۔ اگرچہ اُس کا جسم سماج کے قفس میں قید رہتا ہے لیکن اُس کی رُوح اُس قفس سے پرواز کر کے، آسمانی رفعتوں میں آزادی اَور وسعت کی جستجو کرنے لگتی ہے...... یہ جستجو جلد ہی اُسے احساسِ تنہائی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ اُس کا سماج تو زمین کے ساتھ چمٹا ہُوا ہے اَور وُہ خود آسمانی رفعتوں میں اکیلا محوِ پرواز ہے۔ چنانچہ وُہ اپنی حیرت انگیز قوتِ اظہار کا سہارا لے کر اپنے احساسات و نظریات کو

دُوسروں تک پہنچانے کی پُرزور سعی کرتا ہے اَور تب اُس کی یہ سعی آرٹ اَور لٹریچر کی بے مثال تخلیقات کی صورت میں ایک ایسے حربے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو نہ صرف اُسے اُس کے سماج سے دوبارہ ہم کلام کر دیتا ہے بلکہ جس کے ذریعے سماج کے لاتعداد اَفراد کو ایک دُوسرے سے ہم کلام ہونے اَور یُوں سماجی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے مواقع بھی مل جاتے ہیں۔ پس دیکھا جائے تو سوسائٹی اَور فرد کے مابین جو رشتے اُستوار ہوتے ہیں' اُن میں گفتار اَور صحبت کے بالواسطہ رشتوں کے ساتھ ساتھ آرٹ کا بلاواسطہ رشتہ بھی معرضِ وُجود میں آ جاتا ہے۔

ویسے فرد کا تنہائی سے گریز اَور سماجی ماحول کی طرف پیش قدمی زیادہ تر اُس کی کششِ اِجتماع کی رہینِ منت ہے۔ عام زندگی میں بھی دیکھا گیا ہے کہ وُہ انبوہ کی جانب غیر شعوری طور پر کھنچا چلا جاتا ہے کہ اِس ہنگامے میں کھو کر وُہ اُس احساسِ تنہائی سے محفوظ رہتا ہے جو ازل سے اُس کے تعاقب میں دیوانہ وار بڑھ رہا ہے اَور جو اُس کی مسرت کا شاید سب سے بڑا حریف ہے۔ ایک اجنبی سرزمین پر پہنچنے کے بعد اُداسی اَور کسی اجنبی سے مل کر تسکین کی کمی بھی' اِس طبعی رُجحان کے وُجود پر دال ہے لیکن شاید اِس طبعی رُجحان کا نہایت واضح اثر شہروں کی دِن دُوگنی ترقی اَور وسعت سے بھی ظاہر ہے۔ اِس سلسلے میں اِس بات کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ آغازِ حیات میں لوگ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے' اِسی لیے اُن کا اِقتصادی اَور معاشرتی ماحول ہر قسم کی پیچیدگی سے محفوظ تھا۔ لیکن جب بدلتے موسموں کی بدعنوانیوں اَور فطرت کے تباہ کُن مظاہر سے خوف زدہ ہو کر' اُنھوں نے زمین (Mother Earth) کے ساتھ شدید وابستگی پیدا کر لی تو ایک اَیسا نیا نظامِ حیات معرضِ وُجود میں آنے لگا جس میں ملکیت کا تصور بڑا اَہم تھا اَور ایک نیا اِقتصادی اَور معاشرتی ماحول پیدا ہونے لگا تھا...... وُہ ماحول جو اَپنی ہنگامی کیفیات کے باعث آگے چل کر اِنسان کی کششِ اِجتماع کی تسکین میں ممد ثابت ہُوا اَور جس کی اِسی خصوصیت کی وجہ سے اِنسان اِس کی طرف بڑی تیزی سے کھنچنے لگا۔ ہوتے ہوتے ایک وقت اَیسا بھی آیا جب دیہی زندگی میں اُداسی اَور بدمزگی پیدا ہونے لگی اَور اِنسان کے لیے طویل فرصت کے اَوقات بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ وُہ ہنگامے کی تلاش میں شہری زندگی کی طرف مائل ہونے لگا۔ دیکھا جائے تو آج بھی شہروں کی طرف اِنتقالِ آبادی کی وجہ یہ نہیں کہ دیہات میں نانِ شبینہ میسّر نہیں' وجہ یہ ہے کہ دیہی ماحول زندگی کے وُہ ہنگامہ پرور مناظر پیش کرنے سے قاصر ہے جو شہری زندگی کے اِمتیازی نشان ہیں۔ چنانچہ آج ایک دیہی فرد کے لیے شہری سکونت اِختیار کر لینا نسبتاً

آسان ہے لیکن ایک شہری فرد کے لیے گاؤں میں آباد ہونا اَمرِ محال ہے۔

برٹ رینڈ رسل کی نظر میں:

> دیہی زندگی کرّ و فریب کی زندگی ہے اَور وہاں پانی، ہَوا اَور عناصر کی دُوسری اَندھی قوتوں سے اِنسان کو برسرِپیکار ہونا پڑتا ہے' لہٰذا لوگ شہروں کی نسبتاً محفوظ فضا کی طرف رجوع کرتے ہیں اَور اَپنی زندگیوں کو پُرمسرت بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

لیکن مشہور ماہرِ نفسیات میکڈوگل کی دانست میں شہری زندگی' بذاتِہ کوئی پُرمسرت زندگی نہیں' یہ دیہی زندگی کی بہ نسبت یقیناً زیادہ غیر محفوظ ہے...... بیماری' لاچاری' غلیظ ہَوا اَور گندی خوراک اِسے ناقابلِ برداشت بنا دیتی ہے۔ اِس سب کے باوجود اگر لوگ جُوق دَر جُوق شہروں کی طرف رُجوع کرتے ہیں تو اُن کے اِس اِقدام کے پسِ پُشت "کششِ اِجتماع" کا وُجود ہوتا ہے...... یعنی یہ کہ وہ اس ہنگامہ پرور زندگی میں اپنے اس زخم کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں جو احساسِ تنہائی کی صورت میں شاید اَزل سے اُن کا ہم رکاب ہے اَور جس نے اُن کے لیے زندگی سے تحصیلِ مسرت کے اِمکانات کو انحطاط پذیر کر دیا ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اِنسان نے سماج کی تشکیل کی ضرورت کیوں محسوس کی' اَور ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اِس اِقدام کے پسِ پُشت اُس کی اپنی بقا کا سوال بڑا واضح ہے۔ لیکن سماج کی تشکیل کے مسئلے کے بعد فرد اَور سماج کا وُہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آ جاتا ہے' جس کے مناسب حل پر فرد اَور سماج' دونوں کی مسرت کا بڑی حد تک دارومدار ہے اَور جس میں توازن کی کمی نہ صرف فرد کو مذلت کی گہرائیوں میں گرا دیتی ہے بلکہ جس کی وجہ سے سماجی نظام میں بھی رخنے نمودار ہو جاتے ہیں اَور لاکھوں کروڑوں اَفراد کی مسرت معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔

دیکھا جائے تو فرد کو اَپنے سماج کے ساتھ ذہنی اَور جسمانی مفاہمت (compromise) کے چار بڑے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے (یہ چاروں مسائل فرد اَور سماج کے بڑے مسئلے کے محض اَجزا ہیں)؛ اِن کے مناسب حل پر زندگی کی بیشتر رعنائیوں کا اِنحصار ہے:

(۱) سماجی قوانین کا تحفظ
(۲) کام کاج کا مسئلہ
(۳) جنسی زندگی میں توازن
(۴) قوت کی تقسیم

سماجی قوانین کا تحفظ نارمل خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وہ لوگ جو ذہنی یا اقتصادی وُجوہ کی بنا پر سوسائٹی کے قوانین و ضوابط کو توڑ پھوڑ دینے پر تُل جاتے ہیں، نہ صرف سوسائٹی کے دیگر افراد کی مسرّتوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں بلکہ خود بھی سماج سے علیحدگی اِختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ علیحدگی اُن کی زندگی کو اُسی احساسِ تنہائی سے ہم کنار کر دیتی ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لیے اِنسان نے سماج کی داغ بیل ڈالی تھی...... ایسے لوگوں کے لیے عام شہری زندگی کی رعنائیوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ پاگل خانے یا جیل کی محدود فضا میں زندگی بسر کرنے اور سماج سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

پاگل خانے یا جیل کی طرف فرد کا رجوع تو ایک شدید مثال ہے، ورنہ عام زندگی میں سماجی قوانین کی خلاف ورزی (چاہے وہ ذہنی ہی کیوں نہ ہو) فرد کے ضمیر کی ملامت کو تحریک دے دیتی ہے اور وہ خود اذیتی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اِس سلسلے میں اِس بات کو مدِّ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہماری زندگیوں میں رائے عامہ (Public Opinion) کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے: لہٰذا ہم ہر اُس اقدام سے احتراز کرتے ہیں جو رائے عامہ کو ہمارے خلاف کر دے: اِس کے برعکس ہر وہ کام جس سے ہم اپنے سماج کی خوشنودی حاصل کر سکیں، ہمارے لیے باعثِ مسرّت ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کی تاریکیوں میں جب پہلے پہل کسی فرد نے سماجی قانون کی خلاف ورزی کی اور سماج نے اُس فرد سے قطع تعلق کر کے (اور یُوں اُسے سماجی ماحول سے باہر تنہائی و بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر کے) سزا دی تو یہ بات ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن پر مرتسم ہو گئی کہ سماجی قوانین کا احترام نہ کرنا اپنے لیے سزا کو دعوت دینا ہے۔ اِس کے برعکس سماجی قوانین کا احترام کرنے اور سماج کی خوشنودی حاصل کرنے سے فرد کو زیادہ سہولتیں ملنے کی توقع تھی: لہٰذا یہ بات اُس کے لاشعور میں پختہ ہو گئی کہ اُس کے لیے سماجی قوانین کا احترام نہایت ضروری ہے۔

تاہم اِنسانی تاریخ، فرد کی مختصر سی زندگی میں بھی خود کو کلیتہً دُہرا دیتی ہے۔ بچّے کے اخلاقی معیار کو سنوارنے اور سماجی ماحول میں ایک اچھا شہری بنانے کے لیے والدین اُسے اخلاقی طور پر بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور سزا کا خوف اور جزا کا لالچ دے کر سماجی قوانین کے احترام کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اوّلیں اِنسان کی طرح بچّے کے لاشعور میں بھی یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ اُسے اُن تمام اِقدامات سے گریز کرنا چاہیے جو اُس کے والدین کی نظروں میں غلط اور غیر اخلاقی ہیں۔

بعد ازاں جوانی میں داخل ہونے پر جب اُسے اپنی غیر سماجی خواہشات و حرکات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے تو والدین کی جگہ اُس کا وُہ ذہن لے لیتا ہے جس نے والدین کے ردِّ عمل کو قبول کیا تھا...... یہ اِنسانی ضمیر کا آغاز ہے۔

ڈاکٹر فاؤر کی رائے میں:

> عام حالات میں اِنسانی فطرت کی اِس طور تشکیل ہوئی ہے کہ جب ہم اپنے ماضی کے کسی غلط اقدام کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمیں اُس مسرت سے کہیں زیادہ افسوس ہوتا ہے جو ہم نے اُس اقدام کے دوران میں حاصل کی تھی۔ اِس کے برعکس جب ہم اپنے کسی اچھے کام کے متعلق سوچتے ہیں تو ہمیں اُس دُکھ سے کہیں زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے جو اُس کام کو انجام دیتے وقت ہم نے برداشت کیا تھا۔

یہاں تک تو اِنسانی ضمیر، سماجی قوانین کے احترام کو پیشِ نظر رکھ کر، فرد اور سوسائٹی دونوں کی بقا اور مسرت کا کفیل ہوتا ہے لیکن جب ضمیر اور فرد کے مابین کشمکش نیوراتی صورت اِختیار کر جائے تو اِنسانی مسرت کو شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے ...... اور یہ خطرہ اِس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اِنسان اپنے ضمیر کی آواز سے متاثر ہو کر اپنی حیوانی خواہشات کا گلا تو سختی سے دبا دیتا ہے مگر یہ خواہشات ختم نہیں ہوتیں اور جب بھی موقع ملے دوبارہ شدّت اِختیار کر جاتی ہیں۔ اِس پر اِنسانی ضمیر اور بھی تحریک لیتا ہے...... ہوتے ہوتے یہ کشمکش ایسے مقام پر جا پہنچتی ہے جہاں فرد خود اذیتی پر اُتر آتا ہے۔ کوئی فرد جتنا نیک ہوگا، اُتنا ہی اُس کا ضمیر زیادہ مضبوط ہوگا...... شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے پیغمبر اور اوتار خود اذیتی کا شکار تھے۔

سوسائٹی کے قوانین کی خلاف ورزی جہاں خود سوسائٹی کو مجبور کر دیتی ہے کہ فرد سے قطع تعلق کرے، وہاں فرد بھی اپنے ضمیر کی ملامت سے متاثر ہو کر، خود اذیتی کے دور میں داخل ہو جاتا ہے (اگرچہ یہ حقیقت مستثنیات کے بھی تابع ہے)۔ مگر اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فرد کو محض ایک ایسی مشین میں تبدیل کر دیا جائے جو سوسائٹی کے احکام و قواعد کے مطابق سرگرمِ عمل رہے اور جس کی آزادی اور اِنفرادیت صفر کے برابر ہو۔ اِس کے برعکس فرد کے سوسائٹی کے ساتھ سمجھوتے کا صحت مند پہلو وُہی ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے فلسفے کا بنیادی نکتہ قرار دیا ہے...... یعنی یہ کہ فرد کی بقا، ملت کا ایک ضروری جزو ہو جانے کی وجہ سے ہے؛ ورنہ قوم یا ملت کے قلعے کے باہر فرد کی حیثیت محض ایک عضوِ معطل کی سی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علامہ اقبال سوسائٹی کے زیرِ سایہ، فرد کی اِنفرادیت کو پالنے پوسنے اور

اس کی خودی میں وسعت اَور پھیلاؤ پیدا کرنے کے بھی متمنی ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق فرد کو چاہیے کہ وُہ اپنی خودی کو اِس قدر وسعت دے کہ خالقِ کائنات تک سے ہم کلام ہو سکے۔ فلسفۂ اقبال کے بظاہر یہ متضاد نظریات اُن کے اَشعار سے واضح ہیں:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اَور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہ شعر فرد کو ملّت میں مدغم ہو جانے کی ترغیب دیتا ہے لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وُہ فرد کو اَپنی اِنفرادیت کے پھیلاؤ کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں:

خودی کو کر بلند اِتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے: بتا تیری رضا کیا ہے!

اِسی طرح ایک خوبصورت شعر میں اِن دونوں بظاہر متضاد نظریات کو وُہ ایک ہی شعر میں سمو کر یُوں پیش کرتے ہیں:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گِل بھی ہے
اِنھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے

بعض لوگوں کی دانست میں اقبال کے فلسفے میں یہ متضاد نظریات ایک دُوسرے کی نفی کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے فلسفے کا عمل (Effort) اَور رضا (Resignation) کے اِن متضاد رُجحانات پر اُستوار ہونا، ہمیں فرد اَور سوسائٹی کے مابین اس صحت مند رشتے کی تفہیم میں مدد بہم پہنچاتا ہے جو پُرمسرت سماجی زندگی کے لیے اَز بس ضروری ہے۔

فرد اَور سماج کا دُوسرا مسئلہ کام کاج کا مسئلہ ہے جس کی اَہمیت کا اَندازہ فقط اِتنی بات سے ممکن ہے کہ شاید خطِ اِستوا کے بعض منتخب مقامات کے سوا اِنسان اِس کُرۂ اَرض پر کہیں بھی کام کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ وُہ کام نہ کرے تو نہ صرف سردی، گرمی، طوفان اَور بھوک سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا بلکہ اُس کی تہذیب کا اِرتقا اَور اُس کے سماج کا سارا ڈھانچا بھی اَدھورا رہ جاتا ہے۔

ویسے بھی دیکھیے تو اِنسان بچپن کے ایام میں اپنے سماج پر ایک بارِ گراں کی حیثیت رکھتا ہے اَور چونکہ دُوسرے جانوروں کے برعکس وُہ ایک طویل مدّت تک اپنی ضروریات کا کفیل خود نہیں ہو سکتا، لہٰذا اُسے اپنے تحفظ، اپنی خوراک اَور زندگی کی دُوسری سہولتوں کے لیے اپنے سماج کا دست نگر ہونا پڑتا

ہے۔ لیکن سماج بچّے پر سرمایہ اِس اُمید پر لگاتا ہے کہ بڑا ہونے پر وُہ اِس سرمایے کو مع سود ادا کرے گا۔ چنانچہ جوانی میں داخل ہوتے ہی فرد کے لیے لازمی قرار پاتا ہے کہ وُہ اپنا قرض اُتارنے کی کوشش کرے اور مسلسل کام سے اپنے سماج کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہو۔ وُہ لوگ جو اِس بوجھ کو سہار نہیں سکتے اَور کام کاج سے غفلت برتتے ہیں، سماج اُن سے بے اعتنائی برتنے لگ جاتا ہے اَور اُن کی زندگی تنہائی اَور بے بسی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ پس فرد کی اپنی مسرّت اَور اُس کے سماج کی بہبود کے لیے اَزبس ضروری ہے کہ وُہ ایسے کام کرے جن سے سماج کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگیں اَور جن کے طفیل اِجتماعی مسرّت میں خاطر خواہ اِضافہ ہو۔ فرد اَور سماج کے اِس مسئلے کو بہتر طور پر حل کرنے کے لیے ہمیں شہد کی مکھیوں کی سی تنظیم کی ضرورت ہے کہ اُن میں سے ہر مکھی مسلسل کام سے نہ صرف خود فائدہ اُٹھاتی ہے بلکہ شہد کے چھتّے کے اِجتماعی مفاد کو بھی پیشِ نظر رکھتی ہے۔

موجودہ زمانے میں کام کاج کے مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اِس کے بغیر فرد طویل فرصت کے اُن لمحات کو بسر کرنے سے قاصر ہے جن میں بیشتر اَوقات تنہائی اَور اُکتاہٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فی زمانہ فرد جس شدّ و مد سے اپنے کام میں منہمک ہے، اُس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ سارا کام اُس کی بقا کے لیے اَزبس ضروری ہے (کیونکہ اِس سے بہت کم کام کرنے پر بھی وُہ نارمل زندگی بسر کر سکتا ہے)، اُس کی وجہ یہ ہے کہ اِس اِنہماک کے طفیل وُہ اُس احساسِ تنہائی اَور اُکتاہٹ سے آزادی حاصل کر سکتا ہے جو ہر قدم پر اُس کا پیچھا کر رہی ہے۔ اِس دُنیا میں بہت سے ایسے دولت مند بھی ہیں جو زندگی بھر کوئی کام نہ کریں تو زندگی کی سہولتیں پھر بھی اُنھیں میسّر رہیں گی؛ لیکن وُہ اپنے لیے نت نئے کام اِس لیے ڈھونڈتے ہیں کہ اُس طویل تنہائی کی اُکتاہٹ سے نبرد آزما ہو سکیں جو اُن کے فرصت کے اَوقات پر گہرے بادلوں کی طرح چھائی رہتی ہے۔ کام کاج کے طویل اَوقات کے بعد فرصت کا قلیل لمحہ مسرّت کا حامل ہوتا ہے...... یہی وجہ ہے کہ ہمارے نظام میں سیر و تفریح اَور آرام و آسائش کے لیے ہفتے بھر کے کام کے بعد چھٹّی کا ایک دِن مقرر ہے۔

اِس مقام پر کھیل، تفریح اَور کام کاج کے مابین بنیادی فرق کو واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ کھیل تفریح سے تحصیلِ مسرّت ممکن ہے؛ لیکن کھیل سے حاصل شدہ مسرّت، کام کاج کی مسرّت سے اِس حد تک مختلف ہے کہ اُس کا وجود فرد کے ذاتی اِنہماک کا رہینِ منّت ہے اور اُس کی اپنی نوعیت بھی زیادہ تر اِنفرادی ہے۔ کھیل کی بہ نسبت کام کاج، سماجی پہلو کا کہیں زیادہ امین ہے اور اپنے

تعمیری انداز کے باعث اِجتماعی مسرت کا کفیل ہے۔ دُوسرے لفظوں میں کھیل صرف فرد کو مسرت بہم پہنچاتا ہے! لیکن کام کاج سے سماج کے تمام افراد کو مسرت ارزانی ہوتی ہے۔ البتہ جب کھیل کو زیادہ وسعت دے کر سماجی اَور پھر قومی اَور بین الاقوامی میل جول کا ذریعہ بنا لیا جائے تو نہ صرف یہ افراد کو حصولِ مسرت کے مواقع بہم پہنچاتا ہے بلکہ سماجی نظام کی پائیداری کا بھی موجب ثابت ہونے لگتا ہے۔ گویا کام کاج کی طرح کھیل کا بھی وُہی پہلو اہم ہے جو فرد کو اپنی محدود زندگی کے خول سے باہر نکلنے اَور دُوسرے افراد کے ساتھ میل جول بڑھانے کی ترغیب دے۔

کام کاج سے حصولِ مسرت کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یعنی فنی صلاحیتوں کا اِظہار! جہاں اِس پہلو کی درخشندگی کسی وجہ سے ماند پڑ جاتی ہے وُہیں کام سے حصولِ مسرت کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اِظہار سے مراد یہ ہے کہ کام کے طفیل فرد اپنی لازوال فنی صلاحیتوں کو منظرِ عام پر لا سکے۔ ایک مزدور کہ جسے اپنے کام کا انجام دیکھنا بھی نصیب نہ ہو سکے اَور جس کی ساری تگ و دو کا نتیجہ صرف چند سکوں کی صورت میں ظاہر ہو اُس فنی تسکین (Artistic Satisfaction) کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو مثلاً ایک اعلیٰ معمار کو حاصل ہوتی ہے (جب وُہ اپنی فنی صلاحیتوں کو ایک عمارت کی صورت میں جلوہ گر پاتا ہے) یا اُس فن کار کو ارزانی ہوتی ہے جو آرٹ اَور لٹریچر کے ناقابلِ فراموش شہ پارے تخلیق کر دیتا ہے۔ معمار یا فن کار اپنے کام کو بارِ گراں تصور نہیں کرتا کہ اِس کام کے دَوران میں اُسے بے اندازہ مسرت حاصل ہوتی ہے اَور وُہ اپنے کارہائے نمایاں کے طفیل اِجتماعی مسرت میں اضافے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں اِس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اکثر و بیشتر کام میں دلچسپی اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب انسان ایسا کام کرے جو اُسے پسند ہو نہ کہ ایسا کام جس سے وُہ محض زندہ رہ سکے۔ فی زمانہ سماجی بدنظمی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اُجرت پر ایسا کام کرنے پر مجبور ہیں جس میں اُنھیں شاید ذرہ برابر دلچسپی نہیں (ہمارے ملک کے بیشتر ادیب اسی بدقسمت طبقے سے تعلق رکھتے ہیں)...... جب وُہ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو اپنے سرمایے کی بدولت حسبِ منشا کام منتخب کر لیتے ہیں تو اُن میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ جاتی ہے! ایسے میں وُہ سماجی نظام کے پرخچے اُڑانے پر تُل جاتے ہیں۔ دراصل فرد اَور سماج کی اُستواری کے لیے کام میں دلچسپی کا پہلو اِس قدر ضروری ہے کہ (میری نظر میں) شخصی ملکیت کا تصور مستحسن قرار پاتا ہے...... وجہ یہ کہ احساسِ ملکیت، کام کاج میں فرد کی دلچسپی اُ ک کو فر یہم کر سکتا ہے تاہم ملکیت کی ایک حد ہونی چاہیے کیونکہ جہاں

کہیں دولت کی ناروا تقسیم ہوتی ہے' وہاں معاشرتی اور اقتصادی انصاف پر کاری ضرب لگتی ہے اور فرد کے لیے سماجی ماحول ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔

ہیرن وولف کے مطابق' سماجی زندگی میں کام کاج کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ انسان کھاتا پیتا اور سوتا ہے اور یوں اپنے اندر فالتو قوتوں کا ایک ذخیرہ تیار کر لیتا ہے۔ اگر کام کاج میں دلچسپی اور انہماک کے ذریعے وہ ان فالتو قوتوں کو صرف نہ کرتا ہے تو لامحالہ یہ قوتیں بجلی کی طرح خود انسان پر ٹوٹ گرتی ہیں اور وہ زندگی کی منفی راہوں مثلاً دیوانگی' خودکشی وغیرہ کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف سوسائٹی خود بھی ایسے اعضا کو اپنے جسم سے کاٹ پھینکتی ہے جو ناسور زدہ ہو چکے ہوں اور غیر سماجی حرکات پر اتر کر سماجی نظام کے لیے خطرے کا باعث بن چکے ہوں۔ ایسے بیمار اعضا وہ چور' ڈاکو' پاگل اور جرائم پیشہ لوگ ہیں جنھیں شہری زندگی کے بجائے جیل یا پاگل خانے کے محدود قفس میں دھکیل دیا جاتا ہے اور وہ عام زندگی کی مسرتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس ساری بحث و تمحیص کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ محض کام کاج ہی زندگی کی منزل ہے۔ محض کام کاج کو زندگی کی منزل قرار دے دینا فرد کے لیے اکثر و بیشتر مہلک ثابت ہوتا ہے اور وہ زندگی کی دوسری شاہراہوں پر آزادانہ گھومنے پھرنے اور محظوظ ہونے سے محروم رہ جاتا ہے۔ عام زندگی میں ایسے انسان کی آنکھیں نہ صرف کائنات کی خوبصورتی کے لیے اندھی ہو جاتی ہیں بلکہ وہ سوشل تعلقات میں بھی خود غرضی کے شدید رجحانات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فرصت کے لمحات سے محظوظ ہونے کی صلاحیتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ جب سب لوگ آرام کرتے ہیں' اس وقت بھی وہ کام میں منہمک رہتا ہے: اگر کسی وجہ سے اس کے پاس کام نہ ہو تو وہ انتہائی بے بس اور مایوس نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس بنیے کی سی ہے جس نے دولت کو ذریعہ و وسیلہ (means) سمجھنے کے بجائے مقصد (end) سمجھ لیا اور ساری زندگی محض اسے اکٹھا کرنے میں گزار دی مگر جس سے نہ تو اس نے خود کوئی معقول فائدہ اٹھایا اور نہ ہی اپنے سماج کو فائدہ اٹھانے کی اجازت دی۔

جنسی زندگی میں توازن، فرد اور سماج کا وہ تیسرا مسئلہ ہے جس کے مناسب حل پر ایک حد تک دونوں کی مسرت کا دار و مدار ہے لیکن جس پر کچھ زیادہ توجہ صرف نہیں کی گئی۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سماجی قوانین سے انحراف یا کام کی عدم موجودگی، خود فرد کے لیے مہلک تھی لیکن جنسی زندگی میں توازن کی کمی فرد کو کوئی خاص نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ فرد نے اپنی ذاتی منطق یا اندازِ نظر

کا سہارا لے کر جنسی زندگی کے متعلق چند اصول وضع کر لیے اور وہ اپنی جنسی زندگی میں ہر قسم کی بیرونی مداخلت کو ناقابلِ برداشت تصور کرنے لگا۔ چنانچہ ہم جنسی کے میلان، طوائف بازی اور جنسی بے راہروی وغیرہ کو اس نے اپنی ذات سے منسوب کر کے، خود کو ہر طرح کی سماجی پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دینے کی کوشش کی اور اس نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ جنسی زندگی میں توازن کی کمی سے خود سماج کو بے اندازہ نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔

غور کیجیے تو فطرت نے جنسی مسئلے کو کافی واضح انداز میں پیش کر کے، اس سے نسلِ انسانی کی بقا کا کام لیا ہے۔ ہر وہ پتھر جو جنس کی بہتی ندی کے راستے میں آ گرتا ہے، ندی کو کناروں سے چھلک جانے اور زندگی کی بیشتر دوسری شاہراہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نتیجۃً جنسی بے راہروی، نسلِ انسانی کی بقا کے مسئلے کو نظر انداز کر کے، فرد کو محض لمحاتی لذت بہم پہنچانے کی طرف متحرک ہونے لگتی ہے اور سماجی نظام میں تعفن کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔

کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ فرد خود کو کلیتہً جنس کی طوفانی ندی کے حوالے کر دے اور محض فطرت کے اشاروں پر بہتے بہتے نسلِ انسانی کی بقا کے لیے ممد ثابت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فطری جنسی میلان کو اس کی سادہ ترین صورت میں تسلیم کر لینے سے فرد ان غیر سماجی حرکات مثلاً جنسی بے راہروی، ہم جنسی، طوائف بازی وغیرہ سے محفوظ ہو جائے گا جو ایک طرح سے سماجی نظام کی دیرینہ دشمن ہیں۔ لیکن محض ایک حیوان کی طرح فطرت کے اشاروں پر ناچتے رہنے سے اس کی وہ لازوال فنی اور ذہنی صلاحیتیں شاید منظرِ عام پر نہ آ سکیں جو اسے نہ صرف حیوان سے ممیز کرتی ہیں بلکہ کائنات کا ایک حیرت انگیز معجزہ قرار دے کر اسے لذت کے بجائے مسرت کے آستاں تک پہنچا دیتی ہیں۔ تو کیا پھر وہ نفسِ سرکش کے خلاف جہاد کرے اور جنسی خواہشات کو مسل دینے، دبا دینے یا حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کرے؟...... نفسیات کی جدید ترین تحقیقات اس جہاد کو (کہ یہ فرد کی زندگی میں بڑی شد و مد کے ساتھ آتا ہے) فرد کی مسرت اور سماج کی بہبود کے لیے مضر قرار دیتی ہیں...... اس لیے کہ نفسِ سرکش مغلوب ہو ہی نہیں سکتا...... یہاں تک کہ اس کے خلاف جہاد کیا جائے تو کہانی کے جن کی طرح ہر اس قطرۂ خوں سے، جو اس کی گردن سے نکلے گا، سینکڑوں نفوسِ سرکش پیدا ہو جائیں گے۔ نفسِ سرکش کا تو ایک ہی علاج ہے کہ اس کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ اگر یہ سوچا گیا کہ دریا کے سامنے بند باندھ دیا جائے تو' کنا سے چھلکنے کا نہیں محض ایک خوش فہمی ہوگی ہاں' یا کو بہنے بھی دیجیے لیکن بند

باندھ کر اُس میں سے نہریں بھی نکال لیجیے...... اپنی مرضی کے مطابق کسی نہر کو حبّ الوطنی کے خارزار میں لے جائیے اور کسی سے آرٹ اور زندگی کے طویل و عریض علاقوں کو سیراب کیجیے...... جنس کی بے پناہ فالتو قوتوں سے یوں کام لے کر آپ نہ صرف خود مسرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے بلکہ اپنی سماجی زندگی میں بھی توازن اور اعتدال پیدا کرلیں گے اور اجتماعی مسرت کے ضامن ثابت ہوں گے۔

کام کاج کی طرح محض جنسی تسکین کو زندگی کی منزل قرار دے دینا بھی فرد کے حق میں مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنسی آزادی اُسے حصولِ لذت کے بہت سے مواقع فراہم کرتی ہے لیکن اس بات سے بھی شاید انکار نہ ہو سکے کہ بھونرے کی طرح ایک پھول سے دوسرے پھول تک پرواز کرنے سے سیرابی کے ساتھ ساتھ تشنگی بھی فزوں تر ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ ایک روز فرد کی زندگی کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے اور اُسے محسوس ہونے لگتا ہے گویا وہ ایسا بے نوا فقیر ہے جو زندگی کی شاہراہ پر یکہ و تنہا سفر کر رہا ہو۔ اس کے برعکس جنس کو زندگی کا محض ایک شعبہ قرار دیا جائے تو نہ صرف نسلِ انسانی میں اضافہ کر کے فرد کو احساسِ بقا (Sense of Immortality) حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ اس کے ذریعے اپنے اردگرد ایک ایسی سوشل فضا بھی قائم کر لیتا ہے جس میں خاندان کے تمام افراد کو اس کی شکست و فتح سے انتہائی دلچسپی ہوتی ہے اور جو اس کی مسرت اور غم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جنسی تسکین کی طرف فرد کا رجحان سماجی نظام کی تشکیل کے لیے انتہائی لازمی ہے۔

چوتھا اہم مسئلہ ”قوت کی تقسیم“ ہے کہ جسے مناسب طور پر حل کرنا انفرادی و اجتماعی مسرت کے حصول کے لیے بے حد ضروری ہے۔ میں نے ارادۃً دولت کی جگہ قوت کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے کہ دولت، قوت ہی کی ایک صورت ہے...... یہ الگ بات کہ دولت کی قوت صحیح قوت نہیں اور اس نے اجتماعی زندگی کی بعض غلط کروٹوں سے جنم لے کر فرد اور سماج کو صدہا سال سے اپنے خونیں پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ لیکن شاید میری بات ابھی واضح نہیں ہوئی۔ میں دراصل کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دولت کی ناروا تقسیم نے انسان کو طبقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے اور یوں جنگ، قحط، بادشاہت اور سرمایہ داری کو معرضِ وجود میں لا کر فرد اور سماج کو ایک ایسی غلط روش پر گامزن کر دیا ہے کہ آج انسان اس کے خلاف پورے عزم اور شدت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ دولت کے خلاف انسانی بغاوت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دولت سچی قوت نہیں یہ بعض خود غرض افراد اور طبقات کی

پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ آج جمہوریت، سوشلزم، کمیونزم اور ایسی دیگر تحریکوں کا سہارا لے کر انسان ایک ایسے نظامِ حیات کی طرف گامزن ہو رہا ہے جس میں آخرش دولت کی ناروا تقسیم کا تصور حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔

یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں، آیا انسانی مسرت کا تمام تر دارومدار قوت کی مساوی تقسیم پر ہے: کیا قوت فطری طور پر کبھی مساوی رہ سکتی ہے: کہیں ایسا تو نہیں کہ ہوا کے چلنے سے خزاں زدہ پتوں کی طرح اکٹھا ہوتے رہنا ہی اس کی فطرت ہو...... دولت کی صورت میں نہ سہی، کسی دوسری صورت میں، یہ ایک ایسے فرد کے پاس جمع ہو جائے جو دوسروں سے امتیاز حاصل کر لے اور جس کے سامنے عوام کو جھک جانا پڑے! علامہ اقبال نے کہا ہے: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا...... لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ جب یہ کم بخت دیدہ ور پیدا ہو جائے تو دنیا کو (چاہے وہ کمیونزم کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو) اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر سربسجود ہو جانا پڑے اور وہ اس بات کو بھول جائے کہ اس نے تو قوت کے ایک فرد کے پاس جمع ہو جانے کے خلاف بغاوت کی تھی: کہیں سٹالن کی مثال تو اس ضمن میں پیش نہیں ہو سکتی!...... یہ سوالات گہری توجہ کے طالب ہیں اور ان کے مناسب حل پر ماحول اور سوسائٹی کی تشکیل کے نظریات میں توازن اور اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔

فرد، سماج اور مسرت کی اس ساری بحث کو ختم کرنے سے پہلے اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ انسانی مسرت کوئی جامد یا ساکن چیز نہیں۔ یہ ملکیت میں اضافے یا سماجی ماحول میں ایک خاص بلند مقام حاصل کر لینے سے فرد کو ارزانی نہیں ہوتی، اس کا حصول ان مفید اور مسرت بخش اقدامات کے تابع ہوتا ہے جن کے ذریعے فرد اپنے سماج کو زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو سماجی زندگی میں اخلاقی اور اخلاقیاتی اقدامات کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ فرد کو خود غرضی (Selfish Ends) سے بے غرضی (Un-selfish Ends) کی طرف راغب کر دیں تاکہ وہ اپنے چاروں طرف پھیلے سماج کو مسرت بہم پہنچانے میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکے۔

* * *

maablib.org

اختتامیہ

انسان ازل سے مسرت کی تلاش میں ہے اور ابد تک رہے گا۔ لیکن مسرت مقصود بالذات نہیں؛ اس کی منزل زندگی کی بقا ہے؛ اسی لیے اس کا حصول اُن حالات میں زیادہ ممکن ہے جن میں مفاہمت، میل جول اور جذب وکشش کے زیادہ مواقع ہوں۔ اس کتاب میں مسرت کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لینے کے دوران میں مَیں نے اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھانے کی ہلکی سی کوشش کی ہے کہ مسرت کا حصول احساسِ تنہائی کو مفلوج کرنے اور دوسرے افراد سے قریب تر ہونے ہی میں پنہاں ہے۔ چنانچہ محبت میں محبوب سے قرب، آرٹ میں دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کی ذہنی اور روحانی تصورات میں انسان کے لیے بے لوث محبت کا جتن دراصل ایسی صورتیں ہیں جو افراد کے مابین مفاہمت پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوتی ہیں اور جن کے نتیجے میں اجتماعی مسرت میں بدرجۂ غایت اضافہ ہوتا ہے..... پس اس زاویے سے بھی اس کتاب کا مطالعہ رائیگاں نہ ہوگا۔

مسرت کے موضوع پر مغربی ادب میں بے شمار کتابیں موجود ہیں اور مشرقی زبانوں میں بھی یہ موضوع خاصا اہم رہا ہے۔ لیکن از بسکہ اردو ادب میں فلسفیانہ مسائل اور خاص طور پر زیرِ بحث مسئلے پر بہت کم غور و فکر ہوا ہے؛ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس ضمن میں کچھ کہنے کی کوشش کی جائے۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسرت کی ماہیت کے بارے میں مَیں خود بھی تذبذب میں تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے بیشتر عقدوں کو حل کرنے کی سعی کروں۔ چنانچہ اس کتاب کی تیاری کے دوران میں مجھے اس مسئلے پر مزید مطالعے اور غور و فکر کا موقع ملا۔ میں وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اس تلاش میں مسرت کو میں نے پا لیا ہے، تاہم مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ کئی بار مجھے اس سے قرب

کا شدید احساس ضرور ہوا ہے۔

مسرت کے موضوع پر سوچنے اور لکھنے کی ضرورت مجھے اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ تقسیمِ عظیم کے بعد سے ہمارے ملک میں سماجی، اقتصادی اور طبقاتی اُلجھنوں نے مسرت کے سوتوں کو ایک حد تک خشک کر دیا ہے اور جہاں عام زندگی میں سطحیت اور تصنع نے گہرائی اور خلوص کی جگہ لے لی ہے، وہاں ہم لوگ بتدریج مسرت کے ارفع تصورات سے ہٹ کر سستی لذتیت کا شکار ہونے لگے ہیں اور خطرہ ہے کہ یہ حالت زیادہ دیر تک قائم رہی تو ہم زندگی کی اعلیٰ اقدار (Great Values) سے کہیں محروم ہی نہ ہو جائیں! ہمارے سماج، ادب، تعلیم اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر ایسی صورتِ حال کے مضر اثرات کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب اعلیٰ اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینے کی ایک ہلکی سی کاوش ہے۔۔۔۔۔۔ توقع ہے کہ اب اس سے بہتر کاوشیں بھی منظرِ عام پر آنا شروع ہو جائیں گی۔

اور اب چند الفاظ اس کتاب کے عنوان کے بارے میں۔ یوں تو شاید "مسرت کا مسئلہ"، "مسرت" یا دوسرے عنوانات کو اس کتاب کے لیے زیادہ موزوں خیال کیا جاتا لیکن ایسے عنوانات سے میرے اندازِ خیال کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ دراصل میں نے اس ساری کتاب میں مسرت کے لیے ریاضی کے اصول وضع کرنے اور "دو اور دو چار" کہنے کی کوشش بہت کم کی ہے اور شروع سے آخر تک زندگی کی گوناگوں کیفیات و مظاہر میں مسرت کی تلاش میں مصروف رہا ہوں۔ یوں سمجھیے کہ اس کتاب میں میرا کام چوراہے کے سپاہی کی طرح صرف منزل کی طرف اشارہ کرنا تھا۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے کہ یہ راستہ مسرت کے بجائے آپ کو کسی اور منزل کی طرف لے جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اسی راہ سے مسرت کے آستانے تک پہنچ جائیں!

یہ "اختتامیہ" تشنہ رہ جائے گا اگر میں اپنے احباب، مولانا صلاح الدین احمد، امجد علی آغا اور وجیہ الدین احمد کا شکریہ ادا نہ کروں جن سے میں نے وقت بے وقت، مسرت کے مسئلے پر تبادلۂ خیالات کیا اور جن کی گفتگو سے میں نے روشنی اور مسرت حاصل کی۔

وزیر آغا

maablib.org

پس لفظ

وزیر آغا کی کتاب "مسرت کی تلاش" پر بات کرنے سے پہلے، میں برٹ رینڈ رسل کی مشہور کتاب Conquest of Happiness کے بارے یہ کہنا چاہوں گا کہ اس کی کتاب فلسفے یا منطق کے علوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جو کہ رسل کی وجہِ شہرت ہیں۔ رسل ایک عملی فلسفی تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں دو عالمی جنگوں اور ان کی پھیلائی ہوئی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ ایک حساس اور دردمند شخص تھا۔ بیسویں صدی کے انسان کی حالتِ زار اس کی برداشت سے باہر تھی۔ کائنات کی گتھیاں سلجھانا، فلسفی کا کام سہی لیکن عرش سے اترے فرش پر بسنے والے انسان کو دیکھا جائے تو ایک اور ہی منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ رسل نے محض کڑھنے کے بجائے انسانیت کے لیے عملی طور سے کچھ کر گزرنے کا تہیہ کیا اور یوں وہ سوشل ریفارمر بن گیا اور اس نے انسان کو درپیش مسائل کا احساس کرتے ہوئے اپنے قلم کا رخ ان مسائل کے تجزیے اور ان کے حل کی طرف کر دیا۔

رسل نے جب دیکھا کہ انسان بہت دکھی ہے اور حقیقی خوشی سے محروم ہو چکا ہے تو اس نے انسانی دکھ (ناخوشی) کے اسباب جاننے کی سعی کی۔ اس نے جان لیا تھا کہ ناخوشی کا ایک سبب تو انسان کے دگرگوں حالات ہیں اور دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ انسان نے کئی ایک غلط رویوں کو اپنا رکھا ہے۔ اس کے مطابق انسان اگر کوشش کر کے ان غلط رویوں کو ترک کر دے اور ایسے رویوں کو اپنی زندگی میں شامل کرے جو خوشی کا سبب بن سکتے ہیں تو اس دنیا سے ناخوشی کو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے مذکورہ بالا کتاب لکھی جو دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلے حصے میں، وہ ان رویوں پر بحث کرتا ہے جو خوشی کو برباد کر دیتے ہیں اور دوسرے حصے میں، وہ خوشی کے اسباب پر

تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔

رسل نے یہ کتاب عام لوگوں کے لیے لکھی تھی کیونکہ اس نے عمومی سطح پر محسوس کر لیا تھا کہ افراد کی اکثریت ہی ان غلط رویوں کی حامل ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عام قارئین واجبی سی تعلیم اور سمجھ بوجھ کے مالک ہوتے ہیں جن کے لیے فلسفیانہ پیرایۂ اظہار اختیار کرنے سے نہ تو اس کا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور نہ ہی خوشی اور ناخوشی کا گہرا مطالعہ سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خوشی اور ناخوشی کی اصل (Genisis) سے بحث نہیں کی۔

رسل کا نفسیات کا علم بھی خاصا وسیع تھا۔ اُس نے فرائیڈ اور ایڈلر وغیرہ کا غائر مطالعہ کر رکھا تھا۔ لہٰذا اس کتاب کے لکھنے میں اُس کی ذہانت اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ نفسیات کا علم بھی اُس کے بہت کام آیا۔ یہ کتاب پڑھ کر گمان بھی نہیں گزرتا کہ اسے رسل ایسے عظیم فلسفی نے لکھا ہے۔ اس میں نہ تو اَدق اصطلاحات ہیں اور نہ ہی دُور اَز کار اشارات: اُس نے تو عام فہم انداز میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کا اپنا طرزِ عمل ہی اُس کی خوشی کو غارت کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ انسان اگر خوشی اور ناخوشی کے اسباب کو اچھی طرح سمجھ لے اور اپنی اصلاح پر آمادہ ہو جائے تو وہ بہتر زندگی گزارنے میں بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ رسل نے سیکولر انداز میں اُن تمام پسندیدہ اور ناپسندیدہ رویوں کا ذکر کیا ہے جن کی تفہیم خوشی کی ضمانت بن سکتی ہے۔

……

اب میں وزیر آغا کی کتاب کی طرف آتا ہوں جو آج سے تقریباً چھ دہائیاں پہلے شائع ہوئی تھی۔ میں نے یہ کتاب ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ اُس وقت پڑھی تھی جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی کے طلبا کو برٹ رینڈ رسل کی مذکورہ کتاب پڑھاتا تھا۔ رسل کی کتاب میں اتنی بار پڑھا چکا تھا کہ یوں کہیے مجھے اس کے مندرجات زبانی یاد ہو گئے تھے۔ جب میں نے وزیر آغا کی کتاب دیکھی تو قدرتی طور پر خیال پیدا ہوا کہ خوشی کے بارے میں اپنے مصنف کے خیالات سے بھی استفادہ کیا جائے تاکہ ان دونوں مصنفین کی کتابوں کا تقابلی جائزہ بھی لیا جا سکے! اور جب میں اس کتاب کے مندرجات میں سے گزرا تو میرے سامنے ایک اور ہی جہانِ معنی کھل گیا۔

وزیر آغا نے نہایت عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں ''مسرت'' کی توجیہ کرتے ہوئے اس کے سوتوں پر بحث کی ہے۔ رسل کی کتاب کا موضوع ''خوشی کا حصول'' ہے: اُس نے خوشی کی ماہیت اور

حقیقت پر کوئی بحث نہیں کی: وہ تو عام فہم اور آسان زبان میں عام آدمی کی مدد کرنا چاہتا ہے؛ جبکہ وزیر آغا نے مسرت کا بسیط اور مکمل احاطہ کیا ہے اور اس ضمن میں کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ اگر رسل کی کتاب کا موضوع "خوشی کا حصول" ہے تو وزیر آغا نے "خوشی کی تفہیم" کو موضوع بنایا ہے: اور ظاہر ہے کہ خوشی کے حصول سے پہلے خوشی کی تفہیم نہایت ضروری ہے۔ وزیر آغا کا خیال ہے کہ انسان کو خوشی کے مفہوم سے روشناس کرا دیا جائے تو اس کے لیے خوشی کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مسرت کا ناتا آرٹ، لٹریچر، فرد، سماج اور محبت سے جوڑا ہے اور فلسفے کے زینے کی مدد سے اس کے عمق میں اترنے کی کوشش کی ہے؛ اور اس عمل میں ان کے تنقیدی شعور، خلاقانہ مہارت اور عالمانہ جستجو نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

مختصر یہ کہ رسل نے اپنی کتاب خالصتاً ایک عام قاری کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر لکھی ہے جبکہ وزیر آغا کی کتاب ایک ذہین و فطین اور بالغ نظر قاری کے ساتھ ساتھ اس عام آدمی کی دلچسپی کا موجب بننے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے جسے مطالعے کا شوق ہو؛ یعنی انھوں نے یہ کتاب لکھتے وقت ایسا طرزِ بیاں اور اسلوب اختیار کیا جو دونوں طبقوں میں بیک وقت مقبول ہونے کی استعداد رکھتا ہے۔

……

مجھے جب پتا چلا کہ ایک پڑھے لکھے شخص نے وزیر آغا کی کتاب کو برٹ رینڈ رسل کی کتاب کا اردو ترجمہ قرار دیا ہے تو مجھے بہت دکھ ہوا کہ ایسے معروف آدمی سے (جو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا سربراہ ہے) یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے موصوف نے وزیر آغا کی کتاب پڑھے بغیر ایک غیر ذمے دارانہ بیان اخباری کالم میں جاری کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے رسل کی کتاب پڑھی ہو کہ موصوف اپنے قریبی حلقے میں ایک فلسفی قاری کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کے اس بیان سے کم از کم نہ تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسل کی کتاب فلسفے سے تعلق رکھتی ہے اور نہ ہی اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ انھوں نے وزیر آغا کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے...... یہ بھی ممکن ہے کہ موصوف نے یہ بات کسی کے ایما پر لکھی ہو!

بہرحال ایسی بے سر و پا باتوں سے وزیر آغا کی عظمت کو نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں کہ ان کی کتاب پر رسل کی ہلکی سی پرچھائیں بھی موجود نہیں؛ ہاں البتہ موصوف کا فلسفہ ضرور خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ وزیر آغا نے تو اپنی کتاب میں تقریباً تمام یونانی فلاسفہ اور مغربی مفکرین (مثلاً ہیریکلٹس، افلاطون، ارسطو، زینو، اپی کیورس، فرانسس بیکن، ڈیکارٹ، سپائی نوزا، والٹیئر، جان لاک، ڈیوڈ ہیوم، ہابز، بنتھم، جیکو، روسو، کانٹ،

بینتھم، جان سٹوارٹ مل، ہیگل، شوپن ہار، نطشے اور برگساں وغیرہ) کے تاریخی حوالوں کے ساتھ اِن سب کے خیالات کے بارے میں بھی بحث کی ہے؛ مشرقی مصنفین کے حوالے بھی دیے ہیں؛ اور اقبال کے مردِ مومن اور نطشے کے سُپرمین کا موازنہ بھی کیا ہے؛ نیز آئن سٹائن، سر جیمز، ایچ لیوی اور سر اڈنگٹن ایسے سائنس دانوں کے مادّے کے بارے میں خیالات کے حوالے بھی دیے ہیں، اور ہمیں بتایا ہے کہ مسرّت کی اِرتقائی کیفیات کیا ہیں جبکہ رسل کی کتاب کا ایسے مباحث سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

اور آخری بات یہ کہ میری نظر سے آج تک ایسی کوئی تحریر نہیں گزری جو اِتنے بڑے پیمانے پر، اِتنے بھرپور اور مکمل انداز سے "مسرّت" کے موضوع کا اِحاطہ کرتی ہو۔

مظفر بخاری

لاہور
۰۹ مئی ۲۰۱۱ء

maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

یہ کتاب وزیر آغا کی اولیں تصنیف ہے جو ۱۹۵۳ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اور اس کے ابواب میں سے گزرتے ہوئے حیرانی ہوتی ہے کہ مصنف نے صرف "بتیس" برس کی عمر میں! اتنے وسیع اور مشکل موضوع پر ایک جامع کتاب لکھ ڈالی جس میں اُن کا تنقیدی شعور پوری طرح جھلکتا ہے۔ ایسے موضوعات کو نہ تو اُس وقت تک سمیٹا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُن سے انصاف کیا جا سکتا ہے جب تک کہ لکھنے والے کا اپنا مطالعہ حد درجہ وسیع نہ ہو اور اُس نے مطالعے کو جذب کر کے اُس کی قلبِ ماہیئت نہ کر لی ہو۔

وزیر آغا نے "مسرت" کے موضوع کو "مسرت کی تلاش" تک پھیلا دیا ہے تاکہ ادب، آرٹ اور روز مرہ زندگی اور جدید سائنسی علوم خصوصاً حیاتیات، نفسیات اور فلسفے کی گہرائی میں اُتر کر دیکھا جائے کہ مسرت کی کارگزاری کیا ہے اور انسان اس سے کس طرح استفادہ کر سکتا ہے، نیز وہ کون کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے مسرت انسان سے دور ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب میں، اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے یہ واحد کتاب ہے، جس سے نہ صرف قارئین بلکہ آنے والے نقادوں کے لیے بھی روشنی مہیا کی ہے۔

مگر اس کا کیا کیجیے کہ ایک "مفکر" نے اس کتاب کو برٹرینڈ رسل کی کتاب Conquest of Happiness کا لفظی اردو ترجمہ قرار دے کر قارئین کو ۲۰۱۱ء میں گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے اس بات کا نوٹس لیتے ہوئے انگریزی ادب کے استاد پروفیسر مظفر بخاری سے رابطہ کیا جنھوں نے پہلے تو موصوف کے خیالات پر تعجب اور افسوس کا اظہار کیا اور پھر ایک مضمون لکھ کر ہمارے حوالے کر دیا جسے اس کتاب کے اختتامیے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

شاہد شیدائی

اظہار سنز
19۔ اردو بازار لاہور فون: 37230150
مین آفس: 9۔ ریٹی گن روڈ لاہور فون: 37220761
E-mail: Izharsons_2004@hotmail.com
www.izharsons.com